ماہنامہ
بیداری
حیدرآباد

مدیر
☆☆☆
حافظ محمد موسیٰ بھٹو

زیر اہتمام
☆☆☆
سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
۴۰۰- بی لطیف آباد۴- حیدرآباد
E.Mail
m.moosabhutto@gmail.com
www.bedarimillat.com

موبائل نمبر:
03363039299

جلد سترواں ◯ جولائی ۲۰۱۹ء
قیمت: ۲۵ روپے، سالانہ: ۳۰۰ روپے

اہم تفسیری نکات (مستقل سلسلہ)	مولانا اشرف علی تھانویؒ	۲
(اہل محبت واہل سلوک کے لئے قرآنی لائحہ عمل)	محمد موسیٰ بھٹو	
سلیقہ انسانیت کا کا بحران (چھٹی قسط)	محمد موسیٰ بھٹو	۱۱
اور اس سے بچاؤ کی تدابیر		
کرپشن کی بڑھتی ہوئی وبا	عبدالکریم عابد	۱۸
اور اس کے اثرات		
بیمار نظام	سلمان عابد	۲۱
تبدیلی کیسے آئے گی؟		
پاکستان کی معیشت مغربی استعمار کے حوالے	اوریا مقبول جان	۲۶
علم	محمد موسیٰ بھٹو	۳۰
تعمیر سیرت کا ذریعہ یا حجابات کا؟		
زکوٰۃ کی مدنی سبیل اللہ کی تعریف وتفصیل		۳۸
جدید دور کے چیلنج کے پس منظر میں		
مہنگائی	محمد سلیم جباری	۴۴
اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی صورت		
صدی کی بدترین سودے بازی!	عبدالغفار عزیز	۴۸
دونومسلم بہنوں کی (آخری قسط)	بنت عادل	۵۹
ایمان افروز کہانی		

پبلشرز محمد موسیٰ بھٹو نے یادگار پرنٹنگ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ ۴۰۰
بی لطیف آباد-۴- حیدرآباد سے شائع کیا۔ ٹیلیفون: 3861864 (022)

مولانا اشرف علی تھانویؒ
محمد موسیٰ بھٹو

مستقل سلسلہ

اہم تفسیری نکات

(اہل محبت واہل سلوک کے لئے قرآنی لائحہ عمل)

من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فلنحینه حیوٰة طیبه (سورۃ النحل، آیت نمبر ۹۷)

(جو شخص نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس شخص کو لطف والی زندگی عطا کریں گے۔)

حیاۃ طیبہ وہ ہے، جو محبوب کے ساتھ ہو

روح میں بعض کا قول نقل کیا گیا ہے کہ حیاۃ طیبہ وہ (زندگی) ہے، جو محبوب کے ساتھ ہو، اور یہ زندگی اولیاء کو دنیا میں بھی میسر ہے۔

تشریح:

دنیا میں ہر شخص خوشی، حلاوت، سکون، مسرت اور پاکیزہ زندگی کا متلاشی ہے لیکن یہ ساری چیزیں عمل صالحہ پر محنت کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوسکتی ہیں، ایسا عمل صالح، جس میں ایمان بھی موجود ہو، عمل صالحہ میں اخلاق حسنہ، باطنی بیماریوں سے بچاؤ اور اللہ ورسول کی مخلصانہ اطاعت بھی شامل ہے، بلکہ یہ چیزیں اعمال صالحہ کی روح ہیں، ان چیزوں کی سعادت کے نتیجہ میں ہی مسرت، حلاوت اور پاکیزہ زندگی نصیب ہوتی ہے اور یہ زندگی ہر طرح کے غم سے محفوظ زندگی ہوتی ہے، اہل اللہ کو کثرت ذکر اور اللہ سے والہانہ محبت کے نتیجہ میں یہ سعادت عظمیٰ حاصل ہوتی ہے، ان کا دل دنیا کے لئے مچلنے کے بجائے اللہ کے لئے تڑپتا رہتا ہے، انہیں ایک ہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ اللہ محبوب کی رضا حاصل ہو، ان کے سارے افکار اسی ایک فکر میں دب جاتے ہیں، اعمال صالحہ میں بجائے خود سکینت،

مسرت اور حلاوت کی خصوصیات شامل ہیں، لیکن دیکھا گیا ہے کہ بظاہر اعمال صالحہ ہونے کے باوجود سکون سے محرومی اور حلاوت سے ناآشنائی ہوتی ہے، پریشانیاں گھیرے رہتی ہے، چھوٹے سے چھوٹا واقعہ فرد کو متزلزل کردیتا ہے، مزاج میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوتا، اس کا بنیادی سبب یہ ہوتا ہے کہ اعمالِ صالحہ میں اصل روح اور جان موجود نہیں ہوتی، وہ بے دلی سے سرانجام ہوتے ہیں، نیز زندگی کا بنیادی ہدف اللہ کی محبت، عبدیت کے آداب کی پوری طرح بجا آوری اور سب سے یکسو ہوکر، اللہ کا ہوجانے کا ہدف متعین نہیں ہوتا، اہل اللہ چونکہ ذکر وفکر کے مجاہدوں کے ذریعہ اللہ سے یکسو ہوجاتے ہیں، وہ دل کے اندر سے اللہ کے سوا دوسرے نقوش مٹاچکے ہوتے ہیں اور وہ ہر طرح کے حالات میں صبر وشکر کی نفسیات کے حامل ہوتے ہیں، اس لئے انہیں اللہ کی طرف سے حیوٰۃ طیبہ کے اجزاء نصیب ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں جب کہ عام طور پر فرد کی زندگی بے چینی کے انگاروں پر لیٹنے کے مترادف ہوگئی ہے، ایسے حالات میں خوشی، لذت اور حلاوت کی زندی گویا نایاب ہوگئی ہے، اس کا ایک بڑا سبب مادیت پرستی کا عالمگیر ماحول بھی ہے، جس نے پیٹ اور جنس کو معبود کی صورت دی ہے اور جدید ترین تیز آلات کے ذریعہ پیٹ اور جنس کے جذبات کو اتنا مشتعل کردیا ہے کہ سوچ میں فساد پیدا ہوگیا ہے اور لگ بھگ ہر فرد فکری انتشار کا شکار ہوگیا ہے، مادیت کے ان عالمگیر اثرات سے مذہبی انسان بھی بُری طرح متاثر ہے، فضا میں موجود ان ہمہ گیر زہریلے اثرات سے بچاؤ کی واحد صورت ایک ہی ہے کہ اہل اللہ جن کو حلاوت اور پاکیزہ زندگی حاصل ہے، ان کی صحبت کے ذریعہ ان سے یہ اجزاء حاصل کئے جائیں۔

جب سچی طلب کے ساتھ اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے گی اور ان کے دیے ہوئے ذکر پر محنت ہوگی تو اس کی برکت سے فرد وافراد کے لئے ہر طرح کی بے قراری، بے سکونی، انگاروں پر لیٹنے والی اشتعال وانتقام کی حالت اور پیٹ اور جنس کو معبود بنانے جیسی بیماریوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوگی، یہ اہم نکتہ ہے، جسے سکون کے متلاشی افراد کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آیت کے حاشیہ میں بیان شدہ یہ نکتہ کہ حیاۃ طیبہ وہ زندگی ہے، جو محبوب کے ساتھ ہو، یہ بہت اہم نکتہ ہے۔

اس دور میں اللہ محبوب کے ساتھ ہوجانے کا کام سب سے زیادہ دشوار تر ہوگیا ہے، اس لئے کہ ماحول اس کے لئے سازگار نہیں، لیکن فرد اگر اللہ محبوب کے ساتھ یکسو ہوجانے والوں کی صحبت ومعیت اختیار کرے تو ان کی پاکیزہ صحبت کا ماحول انہیں ازخود مادیت پرستی کے ماحول سے اوپر اٹھانے اور اللہ کے ساتھ تعلق مستحکم کرنے کا ذریعہ بنے گا، ان کی مسلسل صحبت کے نتیجہ میں ایک وقت آئے گا کہ انہیں خود اللہ محبوب کے ساتھ حالت وصال کی نعمت عظمیٰ حاصل ہوگی، جو دنیا کے ہر طرح کے تفکرات سے بچاؤ اور آخرت کی زندگی میں محبوب کے مشاہدے کا ذریعہ ثابت ہوگی، اس دنیا میں بھی ان کا دل رفتہ رفتہ اللہ کے انوار حسن کے مشاہدے سے فیضیاب ہوتا جائے گا۔

جدید انسان عقلیت کی تحریکوں کے زیر اثر اہل اللہ کو کوئی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں، اس کی سزا وہ بے قراری کے انگاروں پر لیٹنے کی صورت میں بھگت رہا ہے، اگر جدید انسان میں فساد سے بھری ہوئی اس زندگی سے نجات اور بچاؤ کا احساس پیدا ہوجائے اور وہ تجربے کے طور پر ہی سہی اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے تو ان شاء اللہ اسے حیاۃ طیبہ کے اجزاء حاصل ہونا شروع ہوں گے، جدید انسان نئے نئے تجربات کرنے کا عادی ہے، لیکن اسے روحانی سکون وسکینت کے حصول کے لئے ایک بار یہ بھی تجربہ کرکے دیکھنا چاہئے، حقیقی سکون کے متلاشی افراد کے لئے اہل اللہ کی صحبت نعمت عظمیٰ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے بعد دولت، دنیا اور عزت وشہرت کی زندگی پر وہ لات مارنے، یعنی اس سے دستبردار ہونے کے لئے ازخود تیار ہوجائے گا، اس لئے کہ حیاۃ طیبہ کے بعد کثرتِ دولت، شہرت اور منصب کی کاوشیں اسے بے معنیٰ محسوس ہوں گی۔

حدیث شریف میں ہے کہ فرد آخرت میں اس کے ساتھ ہوگا، جس کے ساتھ اس نے زندگی گزاری ہوگی، دوسری حدیث ہے کہ اگر کسی کو دیکھنا چاہو کہ وہ کس راستہ پر گامزن ہے تو اس کے دوست کو دیکھ لو، تجربات ومشاہدات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرد کی زندگی پر دوست کی صحبت ہی اثر انداز ہوتی ہے۔

وَلَـٰكِن مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْراً فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّهِ. (سورۃ النحل، آیت نمبر ۱۰۶)

(تو ہاں جو جی کھول کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہوگا)۔

وسوسے گناہوں کا موجب نہیں

وسوسوں سے پریشان نہ ہونا چاہئے، کیونکہ ان پر گناہ بھی نہیں ملتا، جب تک اس وسوسے کو پورا کرنے کا مصمم ارادہ نہ کرے۔

تشریح:

راہ سلوک کے طالب وسوسوں سے بہت زیادہ پریشان ہوتے ہیں، اس لئے کہ ذکر کے نور سے نفس کے اندر کی گندگی کی صفائی ہونے لگتی ہے، اس کے اندر سے گند نکلنے لگتا ہے اور وہ وسوسوں کی صورت میں سامنے آنے لگتا ہے، وقتی طور پر وسوسوں کے ہجوم پیدا ہونے کے بعد طالب جوں ہی دوبارہ سہ بارہ ذکر کا سہارا لینے لگتا ہے تو یہ وسوسے رفتہ رفتہ تھمنے لگتے ہیں، وسوسوں سے مقابلہ کرنا، راہ سلوک کے طالبوں کا لگ بھگ معمول ہوتا ہے، یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ طالب کام میں مصروف ہے، یہ وسوسے اسی کی علامت ہیں، لیکن طالب پر یہ اللہ کا فضل خاص ہوتا ہے کہ اکثر معاملہ وسوسوں تک محدود رہتا ہے، یہ وسوسے اعمال بد تک اکسانے کا ذریعہ کم ہی بنتے ہیں، طالب کا جب تک سلوک کا سفر قابل ذکر حد تک طے نہیں ہوتا اور وہ حالت فنا سے حالت بقا میں نہیں آتا، اس وقت تک وسوسے اس کا پیچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، سبب یہ ہے کہ نفسی قوتوں سے آسانی سے جان نہیں چھوٹتی، طالب، دوران سفر وسوسوں کا عادی ہوجاتا ہے، اس لئے وہ انہیں زیادہ اہمیت نہیں دیتا، وہ ان وسوسوں کو سلوک کا لازمی حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ (مرتب)

وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِي الآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِيْن. (سورۃ النحل، آیت نمبر۱۲۲)

(اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبیاں دی تھیں اور وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں ہوں گے)۔

دنیا کی نعمتیں

اس میں دلالت ہے کہ دنیا میں نعمتوں کا مل جانا، مقام عقبی کے لئے نقصان دہ نہیں، اور بعض نے جو یہ کہا ہے کہ مشہور ولی کا مقام غیر مشہور سے کم ہے، اس سے مراد وہ ہے، جس میں شہرت کی آفات پیدا ہوگئی ہوں۔

تشریح:

دنیا میں حاصل ہونے والی نعمتیں ہر صورت میں آخرت کے منافی نہیں، ہاں جب یہ نعمتیں اللہ سے دوری کا ذریعہ بنیں یا بخل کا سبب ہوں یا بڑے پن کا موجب بنیں تو اس وقت یہ نعمتیں آزمائش کی حیثیت اختیار کرجاتی ہیں، مشہور ولی جس سے لوگوں کی بہتر اصلاح کا کام ہو، اس کو حاصل ہونے والی یہ شہرت اس پر اللہ کا فضل خاص ہے۔ البتہ شہرت دوسرے اعتبار سے آفت ہے کہ اس کی وجہ سے بڑا بننے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، اس لئے حقیقی صوفی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ گمنام رہے اور شہرت سے دور ہو، اس کے باوجود اگر اسے شہرت حاصل ہوتی ہے تو ایک تو یہ شہرت من جانب اللہ ہے دوسرے یہ کہ اس سے یہی سمجھا جائے گا کہ اللہ اس سے بڑے پیمانہ پر اصلاح کا کام لینا چاہتا ہے۔ (مرتب)

ولئن صبرتم لهو خير للصٰبرين وصبر وما صبرک الیٰ باالله ولا تحزن عليهم (النحل آیت ۱۲۶- ۱۲۷)

(اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت اچھی بات ہے اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص اللہ ہی کی توفیق سے ہے اور ان پر غم نہ کیجئے۔

صبر کے مراتب

صبر کے بہت سے مراتب (درجے) ہیں صبر للہ، صبر فی اللہ، صبر مع اللہ، صبر عن اللہ اور صبر باللہ، ان سب کی حقیقت اصل رسالہ عربی میں دیکھو اور صبر باللہ سب سے اکمل صورت ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ثابت کیا گیا ہے۔

تشریح:

اللہ کی خاطر صبر کرنا اور صبر سے کام لینا، قرآن میں متعدد مقامات پر اس کی تاکید ہے، صبر ایسی چیز ہے کہ راہ حق پر گامزن ہونے کے لئے بے شمار معاملات میں اس کی ضرورت درپیش ہوتی ہے، نفس کے خلاف مجاہدوں کے دوراں اس کی طرف سے ہونے والی مزاحمت پر صبر کرنا، اسلامی احکامات کی بجا آوری کے وقت پیش آنے والی تکالیف پر صبر کرنا، دعوتی کام کے دوراں رکاوٹوں اور مخالفتوں پر صبر سے کام لینا، مزاج کے خلاف ہونے والی باتوں پر صبر کرنا، جہاد وقتال کے دوراں آنے والی تکالیف پر صبر کرنا، اللہ کی خاطر مخالف کو برداشت کرنا اور ان کو معاف کردینا، معاشی طور پر پیش آنے والی تنگی کے وقت صبر سے کام لینا، لوگوں کی طرف سے اذیت پہنچانے کے مواقع پر صبر کرنا، بیماری پر صبر وشکر سے کام لینا، غرض کہ فرد کو قدم قدم پر صبر سے کام لینے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے، یہ صبر ہی ہے، جو فرد کی شخصیت میں نکھار پیدا کرتا ہے، صبر ہی ہے جو فرد کے درجات کی بلندی کا ذریعہ بنتا ہے۔

صبر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے حق پر قائم رہنے کی استقامت پیدا ہوتی ہے، صبر کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مخالفوں تک کے دل میں داعی کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوتا ہے، اسی لئے قرآن میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: اور نیکی وبدی برابر نہیں ہوتی، آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجئے۔ پھر یکا یک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی، وہ ایسا ہوجائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں۔ (**حٰمٓ سجدہ ۳۴-۳۵**)

بالخصوص نفس کے خلاف مجاہدوں کے سلسلہ میں تو غیر معمولی صبر کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے کہ نفس کی قوتیں روزمرہ زندگی میں پوری شدت سے حملہ آور ہوکر، فرد کو متزلزل کردیتی ہے اور قبض (بے چینی) کی نہ ختم ہونے والی حالت بھی فرد کو سخت امتحان میں ڈال دیتی ہے، اس طرح راہ سلوک میں آنے والے بے شمار افراد نفس کے حملوں کا مقابلہ نہ کرنے اور صبر سے کام نہ لینے کے نتیجہ میں اللہ کی محبت سے محروم ہوکر خسران سے دوچار ہوتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔

طالبوں اور سالکوں کو صبر کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اس لئے کہ نفس کی قوتوں کو پامال کرکے، ان قوتوں کو اللہ کے تابع کرنا ایک مستقل عمل ہے اور نفس کے خلاف روزانہ کی جنگ ہے، اس میں غیر معمولی صبر کے مظاہرے کے بغیر چارہ کار ہی نہیں۔

اللہ کی معیت کا حصول غیر معمولی مجاہدوں کا طالب ہے، اس کے لئے مستقل مزاجی اور غیر معمولی صبر کی ضرورت ہے۔

صبر کی توضیح اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ ہر طرح کے باطل کے خلاف ڈٹ جانا، جم جانا، اللہ کی اطاعت پر ہر طرح کے حالات میں قائم رہنا صبر ہے، یہ باطل، باطنی نوعیت کا ہو یا خارجی نوعیت کا، دونوں نوعیت کے باطل کے خلاف مستحکم ہونا، یہی صبر ہے، اس اعتبار سے صبر نفس کی قوتوں، شیطانی قوتوں اور مادیت پرست قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی کرکے، اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کی اطاعت میں دیدینے کا نام ہے، یہی صبر ہے، جس کے نتیجہ میں دنیا وآخرت میں بہت سارے انعامات کی خوش خبری سنائی گئی ہے، لیکن اس صبر کی شروعات نفس کے خلاف مجاہدوں سے ہوتی ہے، جب فرد نفس کے خلاف معرکہ آرائی میں بڑی حد تک کامیاب ہوتا ہے تو خارجی نوعیت کے باطل سے مقابلہ کرنا اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے۔

فرد کو زندگی اور جسمانی توانائیوں کی یہ نعمت اس لئے ملی ہے، تاکہ اسے آزمایا جائے کہ وہ ان توانائیوں کو اللہ کی رضامندی کے مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے یا خواہشات نفس کے لئے، اس آزمائش سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلہ میں صبر سب سے بنیادی اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے، نفس، شیطان اور مادی قوتوں کے مقابلے سے فرد کی شخصیت میں استحکام، ٹھہراؤ اور توازن آتا ہے، یہ استحکام وتوازن صبر ہی کا مرہون منت ہوتا ہے، صبر ایک اعتبار سے فرد کی جدوجہد سے تعلق رکھتا ہے تو دوسرے اعتبار سے یہ اللہ کے فضل خاص کا نتیجہ ہوتا ہے، اللہ، جب فرد کے نفس اور باطل کے خلاف جہاد اور مستقل مزاجی کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے فضل خاص سے اس کے صبر کے مزاج کو مستحکم کردیتا ہے اور اپنی تائید ونصرت سے فرد کو حق پر گامزن رہنے کی استعداد عطا فرما دیتا ہے، تزکیہ نفس کا کام ہو یا **امر بالمعروف** اور **نہی عن المنکر** کا کام، اس کے لئے صبر، ہمت، حوصلہ اور استقامت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے، فرد جب ان کاموں میں اپنی امکانی حد تک استقامت کا ثبوت دیتا ہے تو اس کے ساتھ اللہ کا فضل شامل ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے اسے مستحکم سے مستحکم تر کردیا جاتا ہے اور اس کے لئے راہیں کھول دی جاتی ہیں۔

قرآن میں ایک جگہ ہے: ''سو انہوں نے ہمت نہ ہاری، ان مصائب کی وجہ سے جو ان پر اللہ کی راہ میں واقع ہوئیں اور نہ ان کا زور گھٹا اور نہ وہ دبے اور اللہ تعالیٰ کو ایسے صابروں سے محبت ہے۔'' (آل عمران آیت ۱۴۶)

ایک اور جگہ ہے: ''کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہوگے، حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دیکھا ہی نہیں، جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو، نہ ان کو دیکھا جو (ثابت قدم رہنے والے) صبر کرنے والے ہیں۔'' (آل عمران آیت ۱۴۲)

قرآن کی اس طرح کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی صبر کی آزمائش کے لئے ملی ہے، اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کون افراد ہیں، جو نفس، مادیت پرست قوتوں اور شیطان کے خلاف جہاد کرنے کی راہ پر گامزن رہتے ہیں، اس طرح کے صابروں اور جہاد سے اعراض کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایک دوسرے سے جدا کرنا چاہتے ہیں اور صبر کرنے والوں کو اپنے انعام واکرام اور اعزاز سے نوازنا چاہتے ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ صبر جہاد میں استقامت کا نام ہے اور سعادت دارین کا ذریعہ بھی، اس لئے صبر کا ملکہ راسخ کرنے کے لئے فرد جتنے بھی مجاہدوں سے کام لے، کم ہیں۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِيْ أَنزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجَا. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۱)

(تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ثابت ہیں، جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی)۔

مقام عبدیت کے برابر کوئی مقام نہیں

اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ مقام عبدیت کے برابر کوئی مقام نہیں اور حضورﷺ اس کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔

تشریح:

مقام عبدیت پر فائز ہونا، سب سے بڑا مقام ہے، حضورﷺ اس مقام کی بلندیوں پر فائز تھے۔

مقام عبدیت بندے سے اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ اللہ کا خالص اور حقیقی بندہ بن کر رہے اور اس بندگی میں کسی دوسرے کی بندگی کا ذرہ برابر بھی شائبہ نہ ہو، نہ نفس کا نہ کسی اور کا، بندے کی ساری خصوصیات وصفات اور ساری صلاحیتیں اس بات سے وابستہ ہیں کہ وہ عبدیت (یعنی بندے ہونے) کے مقام میں ترقی پر ترقی حاصل کرے، اہل اللہ کی ساری جدوجہد اس مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی عبدیت کے پورے طرح آداب بجالائے اور اللہ کی زمین پر اللہ کا بندہ بن کر رہنے کا سلیقہ سیکھے اور اس کا کوئی عمل ایسا نہ ہو، جو عبدیت کے منافی ہو، عبدیت کا یہ مقام کسی حد تک نفس کی فنائیت سے وابستہ ہے، جب تک نفس فنا نہیں ہوتا، عبدیت کی راہ میں سخت رکاوٹیں درپیش ہوتی ہیں اور بندہ، بندگی کے آداب اور اس کے حقوق کی بجا آوری میں ناقص ثابت ہوتا ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً. (سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۷)

(ہم نے زمین کی چیزوں کو اس کے لئے باعث رونق بنایا، تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے)۔

حسن عمل اللہ کے جلال وجمال کے مشاہدہ کا آئینہ ہونا

اس حسن عمل میں یہ بھی داخل ہے کہ زمین کی اشیاء، نہر اور درختوں اور پہاڑوں وغیرہ کو اللہ تعالیٰ کے جلال وجمال کے مشاہدہ کا آئینہ بنائے، ابن عطار نے فرمایا ہے کہ حسن عمل یہ ہے کہ سارے (حوادث) سے بے التفاتی اختیار کی جائے، بعض نے کہا ہے کہ اہل معرفت ومحبت زمین کی زینت (ورونق) ہیں اور حسن عمل ان کی طرف احترام کے ساتھ نظر کرتا ہے۔

تشریح:

حسن عمل کے لئے دل کی آنکھوں کی بیداری کے بغیر چارہ کار نہیں، دل جب بیدار ہوتا ہے اور وہ اللہ کی محبت سے سرشار ہونے لگتا ہے تو سالک کے لئے دنیا کی ہر چیز ایسا آئینہ ہوتا ہے، جو محبوب کے مشاہدے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے، حسن عمل کی وجہ سے سالک دنیا بھر سے بے نیاز ہوجاتا ہے، حسن عمل دراصل محبوب کے انوار وتجلیات کے غلبے کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کے بغیر حسن عمل کی استعداد پیدا نہیں ہوسکتی، یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ اہل محبت ومعرفت چونکہ زمین کی رونق ہیں، اس لئے حسن عمل ان کی طرف احترام کے ساتھ نظر آتا ہے، یعنی اہل محبت ومعرفت حسن عمل کا مجسمہ ہوتے ہیں، حسن عمل ان سے ازخود صادر ہوتا ہے، انہیں حسن عمل کے لئے تکلف کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی، محبوب کے انوار حسن کے مشاہدے کی وجہ سے حسن عمل ان کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے۔

جو سالک حسن عمل کے اس مقام پر فائز ہیں، ان کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے، ایسے افراد ہی زمین کی رونق ہیں اور دنیا انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔

مادیت کے غلبے کے اس دور میں حسن عمل کے اس طرح کے حامل اور عامل اہل اللہ موجود ہے، بس ان تک پہنچنے کی تڑپ موجود ہو تو اللہ ان تک پہنچا ہی دیتے ہیں، ہم جیسے سیاہ کار ایسے اہل اللہ کی صحبت کو ہی بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔

سلیقہ انسانیت کا کا بحران

اور اس سے بچاؤ کی تدابیر

(۷۶) انسانی شخصیت کی تخلیق میں شر اور خیر کی دونوں قوتیں کارفرما ہیں، اس لئے ان دونوں قوتوں کے درمیاں خیالی قوت کے ذریعہ کشمکش اور تصادم کی صورت موجود رہتی ہے، خیر کی قوتیں خیالی قوت کو خیر کی راہ پر لے جانا چاہتی ہیں، جب کہ شر کی قوتیں خیالی قوت پر مادی حسن اور دنیا کی زیب وزینت کے نقش کو مستحکم کرنا چاہتی ہیں، یہ کشمکش ایسی ہے، جو افراد کے ساتھ عام طور پر برسوں تک جاری رہتی ہے اور بیک وقت دونوں خیالات کی لہریں ساتھ چلنا شروع کردیتی ہیں، کبھی فاسد خیالات کی لہر حاوی ہونے لگتی ہے تو کبھی پاکیزہ خیالات کی لہریں، لیکن جلد ہی مادیت پرستی پر مشتمل ماحول کے غلبہ کے اثرات کی وجہ سے خیر کی خیالی قوت کمزور ہوکر بالکل مدھم ہوجاتی ہے اور فاسد خیالات پوری طرح حاوی ہونے لگتے ہیں اور منفی خیالی قوت پوری انسانی شخصیت کا احاطہ کرلیتی ہیں۔

فرد جب اس حالت پر پہنچ جاتا ہے تو پھر صم بکم عمی کی صورت ہوجاتی ہے، تو فرد خیر کی باتیں سننے کا روادار ہی نہیں ہوتا۔

(۷۷) مذکورہ نکتہ کی مزید توضیح کی ضرورت ہے، خیالی قوت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فرد شروع میں اسے جس راہ پر لگانا چاہے، یہ خیالی قوت اس راہ پر بغیر زیادہ مزاحمت کے لگنا شروع ہوجاتی ہے، اگر مثبت اور صحتمند خطوط پر خیالی قوت کا سفر شروع ہوا تو یہ صحتمند خطوط رفتہ رفتہ اتنے توانا ہوجائیں گے کہ نہ صرف خیالات میں پاکیزگی پیدا ہوجائے گی، بلکہ خیالی قوت کا یہ ارتکاز اپنے ساتھ روحانی ووجدانی قوتوں اور فطرت سلیمہ کی گہرائیوں کو بھی ہمراہ لائے گی، جس سے فرد وافراد کے سارے جذباتِ حسن کی تسکین کی صورت پیدا ہوگی اور یہ دنیا جنت کا منظر بن جائی گی۔ لیکن اگر شروع سے خیالی قوت کو منفی رخ پر ڈالا گیا تو اس کی بہت بڑی قیمت جو دینا پڑے گی، وہ یہ ہے کہ دل اور روح کا اضطراب بہت زیادہ بڑھ جائے گا اور ساری دنیا کی دولت اور خوشیوں کا سارا سامان موجود ہونے کے باوجود فرد ذہنی، نفسیاتی، اعصابی اور روحانی امراض کا مجموعہ بن کر رہ جائے گا، اور زندگی بھر جسمانی اور نفسیاتی صحت کے ساتھ ساتھ سکونِ قلبی کے لئے ترستا رہے گا، اس لئے کہ فاسد خیالات اندر میں موجود فاسد مادی قوتوں کو فروغ دینے اور شیطانی قوتوں کی معیت میں زندگی کا سفر شروع کرنے کا باعث بنتا ہے۔

فاسد خیالی قوت کے غلبہ کا لازمی نتیجہ دل، روح اور فطرت سلیمہ کے اجزاء کی بربادی اور مادی، حیوانی، جبلی اور شیطنت کی قوتوں کی ہمراہی کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے، جس کا نتیجہ انسانی جوہروں کی تباہی ہوتا ہے۔

اس وقت انسانیت مادی خیالی قوت کے غلبہ کی وجہ سے ہولناک فکری بحران سے دوچار ہے اور ساری انسانی شخصیت داخلی طور پر موت کا منظر پیش کررہی ہے، یہ سب خیالی قوت کو فساد سے بھرنے ہی کا نتیجہ ہے۔

(۷۸) انسانی نفس کی تہذیب اور تزکیہ کے کام کی مشکلات کو سمجھنا ضروری ہے، اس کے لئے سب سے عبرت انگیز حالات بنی اسرائیل کے ہیں، ان کی تاریخ کے مطالعہ سے انسانی نفس کی ہولناکی اور قہرنا کی پوری طرح واضح ہوکر سامنے آتی ہے۔

بنی اسرائیل کی اصلاح وتربیت کے لئے لگ بھگ چار ہزار انبیاء کرام مبعوث ہوئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی ان کی تعلیم وتربیت کے کام کے لئے متعین ہوئے، فرعون اور فرعونیوں کی غرق یابی کا منظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، لیکن اس منظر کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان کے ایک مؤثر گروہ نے بچھڑے کو معبود بنا کر اس کی پوجا کرنا شروع کردی۔

قرآن مجید یہود کی نفس پرستی کے جن مظاہر کا ذکر کرتا ہے، ان میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں۔

انبیاء کرام، کی تکذیب کرنا، ان سے تمسخر کرنا، ان کی توہین کرنا، یہاں تک کہ خواہشات نفس کی راہ میں انہیں رکاوٹ سمجھکر، انہیں قتل تک کرنا، حسد کا مظاہرہ کرنا، لوگوں

کا ناجائز مال کھانے کی روش کا ہونا، دنیا کی زندگی پر فریفتہ ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جہاد وقتال کے جواب میں یہ کہنا کہ تم اور تمہارا خدا جا کر لڑے ہم تو یہاں سے ٹلنے والے نہیں، بچھڑے کی پوجا کرنا، اللہ کے نبی کے فرمان مطابق گائے کو ذبح کرنے سے لیت ولال سے کام لینا، سودی کاروبار کرنا، اللہ سے گستاخی کے معاملہ میں اس حد تک پہنچنا کہ یہ کہنا کہ جب تک ہم اللہ کو نہیں دیکھیں گے تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کی اپنی اولاد سے بھی زیادہ معرفت کے باوجود آپ سے دشمنی کے معاملہ میں انتہا پر جانا، مشرکین مکہ سے معاہدہ کرنا اور ان کے بتوں کی پرستش کے کام کو رسول اللہ ﷺ کی توحید کی تعلیمات سے زیادہ بہتر سمجھنے کی روش کا ہونا، فرعون اور فرعونیوں کو غرق ہوتے ہوتے دیکھنے کے باوجود عبرت حاصل نہ کرنا، تزکیہ اور تربیت کی خاطر جنگل یا پہاڑی علاقہ میں من وسلویٰ کی غذا سے اکتا کر گیہوں اور پیاز جیسی عام چیزوں کا مطالبہ کرنا، اس کی وجہ سے چالیس سال تک پہاڑی علاقہ میں حیران وسرگرداں ہونا۔

اللہ کی نافرمانیوں کی بنا پر دوبار بادشاہوں کی طرف سے ان کی اینٹ سے اینٹ بجانا اور عبرتناک سزا کا ملنا، اللہ کی کتاب تورات میں خصیص مال کی خاطر تحریف کرنا اور کتاب کی تعلیم کو معمولی قیمت میں فروخت کرنے کی روش کا ہونا، وغیرہ وغیرہ۔

بنی اسرائیل کا یہ اجتماعی کردار ایسا ہے، جو دراصل نفسی قوتوں کی بہیمانہ ''خصوصیات'' کا اظہار واعلان ہے، اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ غلط ماحول میں عادتوں کے استحکام کے بعد تزکیہ وتربیت کا کام مشکل ترین ہوتا ہے، اس صورت میں افراد اللہ کے دوستوں کی راہ زنی کرنے، ان کی آخری حد تک مخالفت کرنے اور ان سے مقابلہ کرنے سے باز نہیں آسکتے۔

امام ابن جوزی نے اپنی کتاب ''تلبیس ابلیس'' میں یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بار اہل کتاب کے مدرسہ میں گئے، آپ نے مفتی صاحب سے فرمایا کہ میں آپ سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں، وہ آپ کے ساتھ آئے، آپ نے ان سے فرمایا کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ یہ بتاؤ کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ میں اللہ کا رسول نہیں ہوں، مفتی صاحب نے کہا کہ یا رسول اللہ، میں اور میری قوم حقیقۃً یہ سمجھتی ہے کہ آپ اللہ کے وہی رسول ہیں، جس کا ذکر ہماری کتابوں میں ہے، لیکن میری قوم آپ پر ایمان نہیں لائے گی، آپ نے فرمایا، اس کا سبب؟ مفتی صاحب نے کہا کہ میری قوم کو دوسروں قوموں پر جو فضیلت وفوقیت حاصل ہے، آپ پر ایمان لانے سے وہ اپنی اس حیثیت کو کیسے ختم کرے گی، آپ ﷺ نے مفتی صاحب سے پوچھا، تمہارے ایمان نہ لانے کا سبب؟ مفتی صاحب نے کہا کہ مجھے اپنی قوم پر جو فضیلت وبرتری حاصل ہے، آپ پر ایمان لاکر میں اسے کیسے ختم کرسکتا ہوں۔

ابن جوزی کی اس روایت کا یہاں مفہوم پیش کیا گیا ہے۔

اہل کتاب کی یہ نفسیات، انسانیت کے اس المیہ کا اظہار ہے کہ مفادات اور برتری وفوقیت کی نفسیات، انسان میں ہر دور میں اتنی پختہ رہی ہے کہ اس سے بلند ہوکر اس کے لئے سوچنا اور حق وصداقت کو صدق دلی سے قبول کرنا، اس کے لئے سب سے زیادہ دشوار رہا ہے۔

آج ہم بھی انسانی نفسیات کے اسی ابتلا وآزمائش سے دوچار ہیں کہ ایک طرف تو مادیت اور نفسانیت کی تیز تر لہریں ہیں، دوسری طرف مخلصانہ طور پر اللہ ورسول کی اطاعت اور مادیت سے بلند ہوکر آخرت کی تیاری کی فکر کی دعوت ہے، ان دونوں دعوتوں کے سلسلہ میں ہماری جو روش ہے، ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کیا ہماری یہ روش کہیں، اہل کتاب کی روش سے مناسبت ومشابہت تو نہیں رکھتی۔

(۷۹) سلیقہ انسانیت کے لئے مجاہدے ضروری ہیں، اس کے بغیر سلیقہ انسانیت سے بہرہ وری نہیں ہوسکتی، یہ مجاہدے اگر اہل تصوف کے ہوں جو اللہ اور لا الہ الا اللہ کے کثرت ذکر پر مبنی ہوتے ہیں تو زیادہ بہتر ہے، لیکن اہل تصوف سے باہر کے مجاہدے مسنون اذکار پر محنت، قرآن سے محبت کا تعلق، نوافل کا خصوصی اہتمام، مسلسل خود احتسابی سے کام لیتے رہنا، وغیرہ یہ مجاہدے بھی ایسے ہیں، جو اللہ سے محبت پیدا کرنے اور اخلاق حسنہ کا موجب بنتے ہیں، مجاہدوں کی یہ خاصیت ہے کہ اس سے نفسی قوتیں پامال ہوتی ہیں، آج کل حقیقی اہل اللہ کی تلاش مشکل ہوگئی ہے، بزرگی کے نام پر دکانداری کی روش غالب ہے، پھر بزرگوں کے ہاں بالعموم مجاہدے بھی ختم ہوگئے ہیں، پندرہ بیس منٹ کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے، پندرہ بیس منٹ کا ذکر مجاہدوں میں شامل نہیں، اس لئے کہ اس سے نفس کی حیوانی قوت میں کوئی خاص تغیر برپا نہیں ہوتا، اس لئے مجاہدے جس نوعیت کے بھی ہوں، اہل تصوف کے مجاہدے ہوں یا ان سے باہر مسنون اوراد اور قرآن سے تعلق اور نوافل کے مجاہدے، یہ سارے مجاہدے نفس کو مہذب بنانے میں مؤثر ہیں، البتہ ان مجاہدوں کے ساتھ صالحین کی صحبت کا اہتمام ضروری ہے، یعنی فرد کو نیک لوگوں کے صحبت کے ماحول کو اپنے لئے حصار کی حیثیت سے اختیار کرنا چاہئے۔

ذکر وفکر کے مجاہدے اور نیک افراد کی صحبت، یہ دونوں چیزیں مل کر فرد کی زندگی میں

صحتمند بنیادوں پر تغیر وتبدل پیدا کرنا شروع کردیتے ہیں اور مادیت کے تھپیروں سے بچا کر، اللہ کی راہ پر گامزن کردیتے ہیں، اللہ سے محبت، اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت اور اللہ کے بندوں سے بہتر تعلقات اور اخلاق حسنہ یہ ساری چیزیں مجاہدات کی خصوصیات میں شامل ہیں، اگر کردار میں بہتری وپاکیزگی پیدا ہونا شروع ہوئی ہے، دنیا سے سردمہری کی فضا پیدا ہوئی ہے تو سمجھا جائے گا کہ مجاہدوں نے نفس کی قوت کو پامال کرکے، اسے لوامہ سے مطمئنہ کے مرحلہ میں داخل کر دیا ہے، لیکن اگر دولت، دنیا، اہل دنیا اور راحت کے سامان سے دلبستگی اور تعلق خاطر موجود ہے، اور اہل دنیا کی طرح دولت اور سامان راحت کی حسرت شہرت وناموری کی خواہش موجود ہے اور اس کے لئے کوشش بھی تو سمجھا جائے گا کہ ابھی مجاہدے اس مقام پر نہیں پہنچے، جہاں اس کے پاکیزہ ثمرات اور خصوصیات ظاہر ہوں، ابھی طالب کو ہمت اور مستعدی سے مجاہدوں کی راہ پر چلنا پڑے گا۔

(۸۰) موجودہ دور میں بزرگی کے نام پر شیخ العرب والعجم، قطب الاقطاب، اور شیخ المشائخ جیسے القاب عام ہیں، یہ القاب حقیقی اہل اللہ کے پیام اور اس کی روح کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں، حقیقی تصوف تو فنائیت اور اپنی شخصیت کو آخری حد تک مٹانے کا سبق دیتا ہے اور باقاعدہ سلوک طے ہونے کے بعد عاشق حقیقتہ اللہ کی شان عظمت کے غلبہ کے تحت اللہ کے بندوں میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ سیاہ کار اور حقیر سمجھنے لگتا ہے اور یہ نفسیات اس پر اتنی غالب آجاتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے ساتھ اس طرح کے القاب کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

اس طرح کے القابات پر خاموشی اختیار کرنا بجائے خود رضامندی کی علامت ہے اور اس پر خوشی محسوس کرنا، یہ تو اللہ کی طرف سے ابتلا وآزمائش کی علامت ہے، ایسے افراد کو جو اپنے مریدوں کے ذریعہ اپنے لئے اس طرح کے القاب استعمال کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، اس کی عام طور پر سزا یہ ملتی ہے کہ انہیں اہل دنیا کے حوالے کر دیا جاتا ہے، ان کے لئے شہرت اور دولت کے راستے کھول دیئے جاتے ہیں، یہ شہرت اور دولت بالآخر ان کے حلقہ کی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا ذریعہ بنتی ہے۔

اس طرح کے القابات کا ایک بڑا نقصان جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ سنجیدہ علمی حلقوں کے لئے اس طرح تصوف کے راستے مسدود ہوجاتے ہیں، دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسانی طبیعتیں عام طور پر اس طرح کے القابات کو ہضم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔

اگر حسن ظن سے کام لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ حکمت عملی کی خاطر یہ القابات استعمال کئے جاتے ہیں تو یہ حکمت عملی بھی صحیح نہیں، احادیث میں خودثنائی (وہ چاہئے کتنی ہی بہتر حکمت عملی سے اختیار کی جائے) اس کی سختی سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔

(۸۱) اسلامی سیاست کا بنیادی اصول تقویٰ ونیکی کو فروغ دینا، اور افراد کی روحانی بالیدگی میں اضافہ کرنا ہے، تاکہ ایک طرف تو بندوں کا اپنے مولا سے تعلق مستحکم سے مستحکم تر ہو تو دوسری طرف اللہ کے بندوں سے اس کے محبت، شفقت ورحم کے تعلقات استوار ہوں، اس طرح اسلامی سیاست افراد کی روحانی وپاکیزہ اخلاقی صلاحیتوں کو جلا دینے کا سبب بنتی ہے، جب کہ موجودہ دور کی جمہوری سیاست افراد کی روحانی بالیدگی، وسیع باطنی دنیا کی خوشی ومسرت اور افراد کے محبت وشفقت پر مبنی باہمی تعلقات سے سرے سے کوئی بحث ہی نہیں کرتی، اس کا سارا زور مادی ترقی وخوشحالی کی باتوں پر ہوتا ہے۔

یہ موجودہ دور کی سیکولر سیاست کا سب سے بڑا المیہ ہے، جمہوری سیاست کی جماعتیں وہ چاہے دینی جماعتیں ہوں یا خالص سیاسی نوعیت کی جماعتیں، ان میں کوئی جماعت بھی افراد کے محبت کے پاکیزہ جذبات کو فروغ دینے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی۔

جب کہ اسلامی سیاست کا بنیادی اصول ہی یہی ہے، اسلامی سیاست میں مادی خوشحالی کا تصور روحانی خوشحالی سے ہی وابستہ ہوتا ہے اس سے جداگانہ نہیں ہوتا۔

ریاست مدینہ یا خلافت کا نظام دراصل اعلیٰ درجہ کی تقوی اور مثالی باطنی وروحانی حالات اور تزکیہ ہی کا نتیجہ اور اس کا ثمرہ تھا۔ اسلامی سیاست کی یہی وہ بنیاد ہے، جس سے معاشرہ اسلامی سیاست سے ہمہ آہنگ ہوتا ہے، لوگ اپنے دکھ درد میں باہم شریک ہوتے ہیں، معاشی طور پر گرے ہوئے افراد کو اوپر اٹھالیا جاتا ہے۔

اسلامی سیاست میں معاشی طور پر ایک دوسرے کو گرانے کی کوششیں مفقود ہوتی ہیں، بلکہ اسلامی سیاست اللہ کے رسول کی اس حدیث کا نمونہ ہوتی ہے کہ تم میں سے کوئی شخص کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے لئے جو کچھ چاہے وہی کچھ اپنے دوسرے بھائیوں کے لئے نہ چاہئے۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان والوں کی آپس کی محبت، رحم دلی اور شفقت کی مثال ایک انسانی جسم جیسی ہے کہ اگر جسم کا کوئی حصہ تکلیف میں مبتلا ہوجاتا ہے تو (وہ تکلیف

صرف اسی حصہ میں منحصر نہیں رہتی بلکہ اس سے) پورا جسم متاثر ہوتا ہے اور پورا جسم جاگتا ہے اور بخار و بے خوابی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ (بخاری شریف)

سیاست سے وابستہ جن افراد میں یہ خصوصیات موجود ہوں، وہی سیاست اسلامی تصورات سے ہمہ آہنگ ہوسکتی ہے۔

اسلام کی باطنی، روحانی اور پاکیزہ اخلاقی تعلیمات سے طبعی مناسبت نہ رکھنے والی جماعتیں روایتی جمہوری جماعتیں تو ہوسکتی ہیں، انہیں صحیح اسلامی جماعتیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ جدید جمہوریت کی بنیاد ہی مادی ترقی کے تصورات پر مبنی ہے، جدید جمہوری نظام کے تحت ہر سیاسی جماعت مجبور ہے کہ وہ پاکیزہ اخلاقی نصب العین سے عاری مادی ترقی وخوشحالی کا پروگرام پیش کرے اور اس کی بنیاد پر معاشرے میں اپنی حیثیت بنائے، وہ افراد معاشرہ کو داخلی، باطنی اور روحانی طور پرسکون سے کس طرح ہمہ آہنگ کرے گی۔ وہ ان کے باہمی تعلقات میں محبت کے اجزاء کس طرح داخل کرکے معاشرہ کو مستحکم کرے گی، اس طرح کے سوالات جدید جمہوری نظام کے تحت قائم جماعتوں کے دستور اور اس کی حکمت عملی میں سرے سے شامل ہی نہیں ہوتے۔

اس کا نتیجہ ہے کہ جدید جمہوری نظام میں رہنے والے افراد بے شمار نفسیاتی، روحانی اور اخلاقی مسائل کا شکار ہوجاتے ہیں، اس طرح معاشرہ نفسیاتی مریضوں کے معاشرہ میں تبدیل ہوجاتا ہے نیز سیاست واہل سیاست کو افراد معاشرہ کی اس حالت زار کی درستگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

عبدالکریم عابد

کرپشن کی بڑھتی ہوئی وبا

اور اس کے اثرات

پاکستان میں اہلِ سیاست کی بدعنوانیاں بے نقاب ہورہی ہیں اور وہ احتساب کے کٹہرے میں کھڑے کیے جارہے ہیں۔ سرکاری افسروں کی رشوت خوری کا بھی حساب کتاب لیا جارہا ہے صنعت کاروں اور تاجروں نے بینکوں اور دوسرے اداروں کے منتظمین کے ساتھ سازباز کے ذریعے جو لوٹ مار کی تھی وہ بھی سامنے آرہی ہے۔ یہ مطالبہ بھی ہے کہ احتساب کے دائرے میں فوجی جنرلوں کو بھی لایا جائے کہ بعض کور کمانڈر ''کروڑ کمانڈر'' کیسے ہوگئے۔ لیکن حکومت کس کس کا احتساب کرے گی! کرپشن کے حمام میں سبھی بے لباس ہیں۔ کیا امیر اور کیا غریب، جس کو جہاں موقع ملا، وہاں اس نے کرپشن کی۔ رکشا والے کا میٹر غلط ہے، گھروں میں بجلی کے میٹروں کی بھی ہیرا پھیری ہے، درزی کپڑا چرالیتا ہے، دکاندار ناپ تول میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ غرض ہر سطح پر کرپشن ہے، اور یہ خیال کہ حکومتی طاقت سے اس کرپشن کو ختم کیا جا سکتا ہے، غلط ہے۔ اس کے لیے تو حکومتی اقدامات کے ساتھ دل اور دماغ کی تبدیلی بھی ضروری ہے، مگر یہ تبدیلی کیسے آئے گی؟

ہم مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب کو اس کرپشن کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ نظام سرمایہ داری نے ہر سینے میں ہوسِ دولت بھڑکا دی ہے، اور سادہ طرزِ زندگی کے بجائے تکلفات تعیّشات کی زندگی کے لیے کرپشن کی جارہی ہے۔ لیکن مغرب میں تو ایسی کرپشن نہیں ہے، جو ہم مشرق میں دیکھتے ہیں۔ مغربی دنیا میں کسی کی کرپشن بے نقاب ہوجائے تو معاشرہ اُس کے خلاف نفرت کا اظہار کرتا ہے، اور وہ اس کرپشن کی سزا بھی پاتا ہے، خواہ یہ کرپشن ٹیکس چوری کی ہو یا غیرعورت سے تعلق کی۔ مگر ہمارے ملک میں کسی شخص کی کرپشن کے ہزار قصے بیان ہوں اور اُس کی بڑی

بڑی بدعنوانیوں کا پردہ چاک ہوجائے، اُس شخص کے خلاف صرف اُس کے سیاسی یا ذاتی مخالفین ہی زبانِ طعن دراز کرتے ہیں، حامیوں کو اپنے گروہ یا جماعت کے رہنما کی کرپشن بری نہیں لگتی۔ عام لوگ بھی اسے کوئی خاص برائی نہیں سمجھتے، بلکہ ہمارے عوام کرپٹ لوگوں کو ہی اپنا رہبر ورہنما بناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ سیاست میں، کاروبار میں، دفتری زندگی میں، قانون اور اخلاق کے ضابطوں سے قطع نظر کرنا ہی ہوتا ہے۔ اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہم اُن علما کو بھی منبرومحراب پر جگہ دیتے ہیں جو معلوم نہیں کہاں سے ایسی دولت لے آئے ہیں کہ شاندار کوٹھیوں میں رہتے ہیں، خدمتگاروں کا لشکر رکھتے ہیں، کاروں اور ہوائی جہازوں میں اڑتے پھرتے ہیں۔

مغرب اور مشرق میں فرق یہ ہے کہ مغرب اپنی مادہ پرستی کے باوجود کرپشن کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں، لیکن ہماری روایتی مذہبی ذہنیت بھی کرپشن کے بڑے بڑے اونٹ نگل جاتی ہے۔ اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ اب کوئی قانون ایسا نہیں رہا جسے توڑا نہ جا سکے۔ اور جب یہ صورتِ حال ہوجاتی ہے تو آخرکار ہر فرد کو اس کا نقصان ہوتا ہے، یا گھرانوں کے لیے اقتصادی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں اور اخلاقی بھی۔ آپ دکان پر جاتے ہیں اور دکاندار کے ہاتھ کٹ جاتے ہیں، گھر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ اصلی کی جگہ نقلی چیز دے دی گئی۔ عام گاہک چھوٹے دکاندار سے، چھوٹا دکاندار تھوک کے بڑے تاجر سے، اور بڑا تاجر کارخانہ دار سے دھوکا کھا جاتا ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر کرپشن کا نقصان ہر شخص کے حصے میں آتا ہے۔ ایک شخص ایمان داری سے برآمدی تجارت کرتا ہے، لیکن دوسروں کی بے ایمانی کے سبب بیرونی منڈی میں اُس کے مال کی کھپت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اندرون ملک بھی یہ ہوتا ہے کہ آپ بیماری سے شفا کے لیے دوا خریدتے ہیں، مگر دوا اور انجکشن جعلی ہوتا ہے۔ آپ بچے کو اچھی تعلیم کے لیے بڑے اسکول میں بھاری فیس دے کر بھیجتے ہیں، لیکن تعلیم کے تاجر اسے اچھی تعلیم نہیں دیتے۔ ٹھیکیدار پل، عمارت، سڑک بنانے میں بے ایمانی کرتا ہے، پیٹرول سے لے کر لال مرچ تک میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ کاریگر اور مزدور کچھ نہیں کر سکتے تو کام چوری کرتے ہیں۔ اس طرح سارا کلچر کرپشن کا ہوگیا ہے۔ اب یہ کلچر کیسے ختم ہو؟

اس کے لیے پہلی ضروری بات تو یہ ہے کہ ہماری قیادت اخلاقی معیارات پر پوری اترنے والی ہو۔ ان کے رہن سہن اور طور طریقے دیکھ کر دنیا یہ کہہ دے کہ واقعی یہ لوگ اصولوں کے پکے، کھرے اور دیانتدار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آج کے دور میں ہمارے حکمران حضرت عمرؓ کی طرح نہیں ہو سکتے کہ کپڑوں میں پیوند لگے ہوئے ہوں، حالانکہ اُس وقت قیصر وکسریٰ کے خزانے مسلمانوں کے قبضے میں آگئے تھے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ اپنے لباس کی طرف توجہ فرمائیں، آپ کو دنیا کے سفیروں سے ملنا پڑتا ہے اور مسلمانوں کو شرم آتی ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا: افسوس تم دونوں امت کی مائیں ہوکر مجھے دنیاداری کی ترغیب دے رہی ہو۔ اے عائشہؓ کیا تم رسول اللہ ﷺ کی اس حالت کو بھول گئیں کہ تمہارے گھر میں صرف ایک کپڑا تھا جس کو دن میں بچھایا اور رات کو اوڑھ لیا جاتا تھا۔ اس پر امہاتِ المومنین بے اختیار رو پڑیں اور دیر تک روتی رہیں۔ حضرت عمرؓ بھی رو دیئے تھے۔

یہ دور اب واپس نہیں آسکتا۔ زمانے کی قدریں بدل گئی ہیں۔ دراصل دوسری پارٹیوں کے منشور اور مینی فیسٹو کاغذی ہوتے ہیں۔ اسلام کا منشور عہدِ صحابہؓ کے زندہ اور چلتے پھرتے لوگ تھے۔ اس آئیڈیل کو چھونا ممکن نہیں ہے، لیکن اسے نظر میں رہنا چاہیے خاص طور پر مسلمانوں کی قیادت کے لیے۔ آج یہ تو ضرور ہوسکتا ہے اور ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی قیادت اگر مغربی ملکوں کی قیادت سے اخلاقی طور پر بہتر نہ ہو تو اُن کے برابر ہو۔ اگر ایسی قیادت ہوگی تو اوپر سے نیچے تک ہر جگہ نیا ذہن ہوگا اور مُردہ ضمیر جاگ سکیں گے۔ ورنہ اوپر کے لوگ لوٹ مار کرتے رہیں تو عوام پر اخلاقی مواعظ کا کیا اثر ہوسکتا ہے، اور احتساب کا ڈنڈا بھی کہاں کہاں کامیاب رہے گا! کرپشن کے کلچر کے خاتمے کے لیے صرف ایک چیز چاہیے اور وہ ہے انقلابِ قیادت، وہ قیادت جس کا اخلاقی معیار ہو۔

بیمار نظام
تبدیلی کیسے آئے گی؟

پاکستان کا بنیادی مسئلہ جمہوری حکمرانی اور ایک ایسا منصفانہ اور شفاف سیاسی، انتظامی، قانونی اور معاشی نظام ہے، جو لوگوں کی بنیادی نوعیت کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ کیونکہ کوئی بھی نظام بنیادی طور پر لوگوں کی ضرورتوں اور خواہشات سے ہی جڑا ہوتا ہے، اور اگر کوئی نظام لوگوں کی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکے تو اس کی اہمیت اور ساکھ پر سوالات اٹھ جاتے ہیں۔ عمومی طور پر ہمارے یہاں لوگوں میں نظام کے حوالے سے تحفظات پائے جاتے ہیں اور وہ نظام سے نالاں نظر آتے ہیں، کیونکہ انہیں لگتا ہے کہ جو نظام یہاں کئی دہائیوں سے رائج ہے، اس میں لوگوں کا مختلف حوالوں سے استحصال کیا جاتا ہے۔

ہمیں لوگوں کی اس رائے کو جس میں وہ نالاں نظر آتے ہیں، محض جذباتیت کی بنیاد پر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچنا ہوگا کہ لوگ جو سوچ رہے ہیں اس کے پیچھے کیا حقائق ہیں، اور وہ کون سے محرکات ہیں جو لوگوں کو اپنے ہی نظام سے نالاں یا لاتعلقی پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے سماجی اور معاشی شعبے کے سرکاری یا ریاستی اعداد وشمار دیکھیں تو ان میں ایک خوفناک محرومی اور پس ماندگی کے گہرے بادل نظر آتے ہیں۔ یہ جو معاشرے میں تیزی سے بڑھتی ہوئی سیاسی، سماجی اور بالخصوص معاشی خلیج ہے، یا امیر اور غریب میں موجود عدم توازن ہے، وہ لوگوں کو مایوس کرتا ہے۔ تعلیم، صحت، روزگار اور انصاف جیسے بنیادی نوعیت کے مسائل پر ریاست کا اپنی ذمہ داریوں سے دست برادر ہونا یا مجرمانہ غفلت کرنا خود ایک بڑا سنگین مسئلہ ہے۔

جب معاشروں کو چلانے کی بنیادی سوچ یا فکر میں طبقاتی تقسیم ہو تو لوگوں کو یکجا کرنا یا ان کے ساتھ یکساں سلوک کرنا ممکن نہیں ہوتا، اور یہ عمل لوگوں میں ریاست کی افادیت کو کمزور کرنے

کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح آج کی دنیا میں جدید ریاستوں کے جو تصورات ہیں، یا جو ہم حکمرانی کے نظاموں میں نئے تجربات دنیا میں دیکھ رہے ہیں اُن سے سیکھنے کے بجائے ہم پرانی، فرسودہ اور روایتی طرز پر مبنی سیاست اور حکمرانی کی مدد سے نظام کو چلائیں گے تو نتائج وہی ہوں گے جو آج دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ دنیا جس تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے اتنی ہی تیزی سے ہمیں بھی اپنی فکر کو درست سمت میں لے جانا ہوگا۔ لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب ہم اپنی سابقہ اور موجودہ غلطیوں کو قبول کریں، اور ان غلطیوں سے سیکھ کر کوئی نیا سبق پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔

سب فریقین کو یہ بنیادی نکتہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم جس بیمار اور لاچار نظام کو چلا رہے ہیں اُس سے کوئی بڑی اور مثبت تبدیلی ممکن نہیں۔ کیونکہ آپ کی نیت درست ہو اور آپ کچھ اچھی پالیسیاں بھی بنالیں، مگر جس عمارت یعنی سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کو بنیاد بنا کر سب کچھ چلانے کی کوشش کی جارہی ہے وہی بڑا مرض ہے۔

چھ معاملات ایسے ہیں جن پر ہمیں زیادہ سوچ بچار کرنا ہوگی:

(۱) انتظامی یا یعنی بیوروکریسی کا نظام، جو عملا اپنے اندر غیر معمولی تبدیلی چاہتا ہے۔

(۲) وسائل کی منصفانہ اور شفاف تقسیم، بالخصوص محروم طبقات کو بنیاد بنا کر ترقی کے عمل کو آگے بڑھانا۔

(۳) ادارہ جاتی عمل کی شفافیت اور افراد کے مقابلے میں اداروں کی بالادستی سمیت سیاسی مداخلتوں کا خاتمہ۔

(۴) ریاست، حکومت اور شہریوں کے درمیان تعلقات کو مضبوط کرنا اور اعتماد کی بحالی۔

(۵) مربوط معاشی نظام، جس میں اغیار پر ہی سارا انحصار نہ ہو، بلکہ خود بھی وسائل پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہونی چاہیے۔

(۶) سیاسی نظام اور سیاست میں بنیادی نوعیت کی اصلاحات کے عمل کو بنیاد بنا کر ایک بڑی سرجری، جو جمہوری سیاست کو مضبوط کرے۔

عمومی طور پر سیاسی نظام میں سیاسی توقعات کا بنیادی مرکز بھی سیاسی قیادت اور سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں۔ حکومت اور حزبِ اختلاف کی عملی سیاست قومی معاملات یا مفادات سے جڑی ہونی چاہیے۔ لیکن ہماری سیاست انتشار، محاذ آرائی، نفرت، دشمنی، تعصب، منافرت، کردار کشی سمیت دیگر امراض سے جڑی ہوئی ہے۔ سیاسی جماعتوں نے ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھنے کے بجائے مزید غلطیوں کو پیدا کرنا ہی اپنی سیاست سمجھ لیا ہے۔ جب آپ سیاست میں کسی کے وجود کو ہی تسلیم نہ کریں چاہے آپ حکومت میں ہوں یا حزب اختلاف میں، تو نظام کی درستی کا عمل مزید مشکل ہوجاتا ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں کو پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنیوں یا خاندانی سیاست کے نام پر داخلی جمہوریت سے جڑے ہوئے مسائل پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ اسٹیبلشمنٹ پر ضرور تنقید کریں اور ہونی بھی چاہیے، لیکن خود اپنی سیاسی اداؤں اور طرزِ عمل کا بھی تجزیہ کرنا چاہیے کہ موجودہ خرابیوں میں ہمارا اپنا کتنا حصہ ہے۔

یہ جو اسٹیبلشمنٹ کی سیاست ہے یا اس کا اثر ہماری سیاست پر بہت غالب ہوگیا ہے، اس کی وجہ جہاں اسٹیبلشمنٹ سے جڑے افراد کی سوچ ہے، وہیں خود اہلِ سیاست بھی اس کے براہِ راست ذمہ دار ہیں۔ جب سیاست عملی طور پر لوگوں میں اپنی ساکھ ہی قائم نہ کر سکے اور حکمرانی سے جڑے مسائل کو اپنی سیاست کی بنیاد نہ بنائے تو اس سے سیاسی نظام میں ایک خلا پیدا ہوتا ہے، اور عملاً اس خلا کی موجودگی میں پس پردہ قوتیں زیادہ متحرک اور فعال ہوجاتی ہیں۔ اس لیے اسٹیبلشمنٹ کے کردار کو سیاسی مداخلت کے تناظر میں کمزور کرنا ہے تو پھر اہل سیاست کو بھی اپنے اندر بہت کچھ تبدیل کرنا ہوگا۔ محض اسٹیبلشمنٹ پر الزام لگا کر مسئلے کا حل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ہمیں خود بھی ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ درکار ہے کہ ہم بھی اپنا رویہ تبدیل کریں۔ خود اسٹیبلشمنٹ سے جڑی طاقتوں کو بھی غور کرنا ہوگا کہ وہ بھی اس وقت اپنے رویوں پر نظر ثانی کریں۔ کیونکہ اگر کسی بڑی تبدیلی کی طرف پیش رفت کرنی ہے تو اس کے لیے سب فریقین کو ایک صف میں کھڑا ہونا ہوگا اور ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ کیونکہ مسئلہ اسٹیبلشمنٹ یا سیاست دانوں کا نہیں، بلکہ خود پاکستان کا ہے، اور پاکستان کو ہر صورت بہتر انداز میں تبدیل ہونا ہے۔

مسئلہ اسٹیبلشمنٹ فوج، بیوروکریسی، سیاستدانوں اور دیگر فریقین کا نہیں ہے، اصل مسئلہ سب فریقین کا مشترکہ ہے جو ادارہ سازی سمیت قانون کے دائرۂ کار میں کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ جو ہماری ناکامی ہے یہ مشترکہ ناکامی ہے، اور سب فریقین کو یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہیے کہ وہ بھی ان موجودہ حالات کے بگاڑ میں برابر کے ذمہ دار ہیں۔ یہ جو ہمارا معاشی بحران ہے یہ کسی ایک حکومت کا پیدا کردہ نہیں ہے، بلکہ ہماری داخلی کمزور سیاست اور معیشت سے جڑا ہوا ہے۔ جو کڑوے فیصلے ہمیں معاشی تناظر میں درکار ہیں وہ ہم کرنے کے لیے تیار نہیں، اور روایتی انداز میں معاشی کھیل کو چلا کر مستقبل کے لیے اور زیادہ خطرات پیدا کررہے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہمیں معاشی بحران سے نمٹنے کے لیے ''معاشی معاہدہ'' درکار ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو سلوک ہماری دو بڑی جماعتوں نے ماضی وحال میں میثاقِ جمہوریت کے ساتھ کیا ہے اس کے بعد اُن سے توقع رکھنا مشکل لگتا ہے۔ اس لیے مسئلہ کسی نئے معاہدے کا نہیں بلکہ سیاسی نیتوں کا ہے۔ جب تک ہماری ترجیحات درست نہیں ہوں گی، ہم کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔

کیونکہ مسئلہ جہاں اتفاق رائے پر مبنی چارٹر کا ہے، وہیں بڑا مسئلہ ہماری سیاسی اور دیگر قیادت کے طرزِ عمل کا بھی ہے جو اصلاحات تو کرنا چاہتی ہیں، لیکن ان اصلاحات میں خود کو شامل کرنے کے لیے تیار نہیں۔ دوسرا ان کے اپنے رویوں میں غیر جمہوری سیاست اور عوام دشمنی پر مبنی سیاست کی سوچ اور فکر غالب ہے۔ ہر سطح پر قائم بگاڑ ایک بڑے مرض یعنی کینسر جیسے مرض کی نشاندہی کرتا ہے، اور عملاً ایسے مرض کا علاج ایک بڑی سرجری ہے جو ناگزیر ہے۔ لیکن ہم ایسے ڈھیٹ ہیں کہ کینسر جیسے مرض کا علاج سر درد کی گولی سے کرنا چاہتے ہیں جو مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ہم میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو طاقت رکھتے ہیں، لیکن ان کی سوچ اور فکر مسائل کے حل کے بجائے ان میں اور زیادہ بگاڑ پیدا کرنے کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں تبدیلی کا عمل آگے بڑھنے کا بجائے پیچھے کی طرف جاتا ہے جو اس ریاستی نظام کے لیے سودمند نہیں ہوتا۔

اب سوال یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟ کیونکہ باتیں کرنا آسان ہے اور مسئلے کی نشاندہی اور اس کے حل کی جانب مؤثر پیش قدمی ایک مشکل کام ہے۔ ہم مشکل کام سے

گھبراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہلکے پھلکے انداز میں ہمارا مسئلہ حل ہو، جو ممکن نہیں ہوتا۔ عملی طور پر سیاست اور سماج کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ سماج کی سطح پر ایک بڑی تبدیلی جو اہلِ دانش کی مدد سے پیدا ہوتی ہے اس کا فقدان ہے۔ لیکن ہمیں مایوس ہونے کے بجائے یہ تسلیم کرنا ہے۔

اوریا مقبول جان

پاکستان کی معیشت مغربی استعمار کے حوالے

آخر کار وہی ہونے جا رہا ہے جس کا ڈر تھا، ڈر نہیں بلکہ یقین تھا۔ پاکستان کے منظر نامے پر چھائے ہوئے معیشت دان، جنہوں نے اپنی تعلیم کے آغاز سے ہی ایڈم سمتھ کے افکار کی لوریاں سنی ہوں، جان مینارڈ کینز کے معاشی تصورات سے علم حاصل کیا ہو اور ملٹن مین کے مالیاتی نظام کی چھتری تلے سوچنا سیکھا ہو، وہ سب کے سب پاکستان جیسے غریب، پسماندہ اور دست نگر ملک کی معیشت کو مغربی استعمار اور کارپوریٹ معاشرت کے تخلیق کردہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف سے باہر لے جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو حلف اٹھانے والے پاکستان کے پہلے وزیر خزانہ ملک غلام محمد سے لے کر موجودہ حفیظ شیخ تک اگر آپ کو کسی وزارت کی مدت میں استحکام نظر آتا ہے تو وزارت خزانہ ہے۔ اس لیے کہ اس وزارت پر عالمی مالیاتی نظام کے منظور نظر ہی بٹھائے جاتے رہے ہیں۔ حکومتیں بدلتی رہیں، وزیر اعظم ادھر سے ادھر ہوتے رہے، لیکن، یہ معاشی پنڈت اپنی وزارت خزانہ سے نہیں ہٹائے جاتے تھے۔ ملک غلام محمد جس نے بعد میں گورنر جنرل بن کر پاکستان کی پہلی منتخب اسمبلی توڑی، اس عہدے پر چار سال تک براجمان رہا۔ بنیادی طور پر چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ، لیکن سول سروس کا تڑکہ لگا اور انگریز کی عملداری کا بیوروکریٹ بن گیا، وہیں سے وزیر خزانہ اور لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد پاکستان کا گورنر جنرل بنا۔ اسکے بعد ایک اور بیوروکریٹ چوہدری محمد علی کو چار سال کے لیے وزیر خزانہ بنا دیا گیا۔ کیمسٹری میں ایم اے کرنے والا اور برٹش انڈیا کی سول سروس کے اکاؤنٹس گروپ میں آیا اور منظور نظر ہو گیا۔ چار سال وزیر خزانہ رہنے کے بعد ۱۲ اگست ۱۹۵۵ کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اسکے بعد ایک اور بیوروکریٹ سید امجد علی کی قسمت جاگی۔ سید مراتب علی جیسے مشہور تاجر کے گھر پیدا ہونے والا، برٹش سول سروس میں آیا تو پاکستان بنتے ہی امریکہ میں سفیر لگا دیا گیا، وہاں سے وفاداری کی سند حاصل کر کے لوٹا تو پاکستان کے وزیر

خزانہ کا عہدہ اس کا منتظر تھا، جہاں وہ تین سال تک رہا۔ مارشل لاء لگا تو ایوب خان نے اس لاڈلے کو اقوام متحدہ میں مستقل مندوب لگا دیا، اس لیے کہ اب ایک اور منظور نظر کی آمد کے ڈنکے بج رہے تھے۔ محمد شعیب، ورلڈ بینک کی ملازمت سے براہ راست وزارت خزانہ کی کرسی پر آ بیٹھا اور پھر ۲۵ اگست ۱۹۶۸ تک آٹھ سال تک پاکستان کی معیشت کی ڈوریاں اسکے ہاتھ میں رہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان پر تین معیشت دانوں کا قبضہ تھا۔ محمد شعیب وزیر خزانہ، شرمیلا فاروقی کے دادا این ایم عقیلی جو سرکاری انویسٹمنٹ کمپنی Picic کے سربراہ تھے اور مرزا غلام احمد قادیانی کا پوتا ایم ایم احمد جو سیکرٹری خزانہ تھا اور برٹش انڈیا کے زمانے کا بیورو کریٹ تھا۔ ان تینوں کا ایک مشترکہ نظریہ تھا کہ مشرقی پاکستان ایک بے پیندے کا برتن ہے۔ اس لیے وہاں جو بھی خرچ کیا جائے گا، ضائع ہوجائے گا، انہوں نے مشرقی پاکستان سے نجات کی راہ ہموار کی۔ محمد شعیب وہ شخص ہے جس نے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کی کینیڈا کی جنرل الیکٹرک کمپنی کیساتھ ۱۳۷ میگاواٹ کے نیوکلیئر انرجی پلانٹ کے دستخط شدہ معاہدہ کو مسترد کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ آج پاکستان انرجی کے بحران کے راستے پر گامزن ہے۔ محمد شعیب وزیر خزانہ کے عہدے سے ہٹا تو ورلڈ بینک کا نائب صدر بن گیا اور اسکے بعد ان تین کے ٹولے میں سے این ایم عقیلی کو تین سال کے لیے وزیر خزانہ کی کرسی پر براجمان ہونے کا موقع دیا گیا۔

یحیٰ خان کے اقتدار میں آنے کے بعد عقیلی کو گورنر اسٹیٹ بینک بنا دیا گیا اور اس تین کے ٹولے کے تیسرے کردار ایم ایم احمد (قادیانی) کو یحیٰ خان نے اپنا چیف ایڈوائزر لگا دیا۔ اسی دور میں ون یونٹ کے خاتمے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ایم ایم احمد اس کمیٹی کا سربراہ تھا۔ یکم جولائی ۱۹۷۷ء کو ون یونٹ ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور یوں مغربی پاکستان کو چار صوبوں میں تقسیم کرتے ہوئے چار بڑے بڑے یونٹ بنا دیے گئے۔

یوں تو ذوالفقار علی بھٹو سوشلزم کے نعرے کی بنیاد پر اقتدار میں آیا، لیکن اسکا وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن تھا۔ یہ شخص بنیادی طور پر ایک ہائیڈرالک انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ تھا۔ کولمبیا یونیورسٹی سے پڑھا ہوا، اور ایسا منتشر خیال آدمی جو مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم کے ملغوبے سے معیشت چلانا چاہتا تھا۔ تین سال تک اس وزارت پر متمکن رہا اور سرمایہ دارانہ نظام کی آزاد معیشت کی بنیادوں کو نیشنلائزیشن کے عفریت سے گرا کر رکھ دیا۔ آخر میں بھٹو نے وزارت خزانہ کیلئے امریکی منظور نظر غلام اسحاق پر بھروسہ کیا اور معیشت اسکے سپرد کر کے علامتی طور پر سیاستدان رانا حنیف کو خزانہ کا قلمدان دے دیا۔ یہی غلام اسحاق خان ۵ جولائی ۱۹۷۷ سے نو سال کے لیے ۲۱ مارچ ۱۹۸۵ تک وزیر خزانہ بنا، وہیں سے چیئرمین سینٹ اور پھر ضیاء الحق کے بعد صدر پاکستان۔ اسکے بعد تین سال کے لیے محبوب الحق کو لایا گیا، مگر اسکی انقلابی تجاویز سے کوئی بھی متفق نہ تھا۔ وہ واپس اقوام متحدہ چلا گیا۔ ورلڈ بینک کا پالیسی ڈائریکٹر لیکن کسی حد تک منفرد سوچ رکھنے والا اس ملک میں نہ پنپ سکا۔

اس کے بعد یہ ملک اگلے تیس سال کے لیے ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور دیگر عالمی اداروں کے تیار کردہ معیشت دانوں، انہی کے منظور نظر بیورو کریٹوں اور انہی کی پالیسیوں کو اپنانے والے سیاستدانوں کا اکھاڑہ بن گیا، اور آج اس اکھاڑے میں وہ دھول اڑ رہی ہے، تصویر تک دکھائی نہیں دے رہی۔ ان تیس سالوں میں اس ملک پر تین کردار حکمران رہے ہیں۔ بینظیر اور اسکی پیپلز پارٹی، نواز شریف اور اسکی مسلم لیگ اور پرویز مشرف۔ لیکن ان تیس سالوں میں پاکستانی معیشت کا ہر محکمہ، وزارت خزانہ، اسٹیٹ بینک، پلاننگ کمیشن، بورڈ آف ریونیو حتیٰ کہ نجکاری کمیشن تک ایسے بیورو کریٹوں اور ٹیکنو کریٹوں کے ہاتھ میں رہا ہے جنہیں اسکول میں قدم رکھتے ہی مغربی استعماری کارپوریٹ عالمی مالیاتی نظام کا ہی درس ملا تھا۔ انکی تعلیم، ٹریننگ، اور زندگی کے مفادات سب کے سب اس خون چوسنے والے سودی عالمی مالیاتی نظام سے وابستہ ہیں۔ یہ اس کے باہر سوچ ہی نہیں سکتے۔ ..... یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے عمران خان کی ریاست مدینہ کو بھی پینسلوینیا ایونیو، واشنگٹن پر موجود آئی ایم ایف کی عمارت کا راستہ دکھا دیا ہے۔ یہی ہونا تھا۔ پاکستان کے پاس اس سے نکلنے کے بہت سے راستے موجود تھے، لیکن عمران خان صاحب کو اس ٹیم نے معاشی بدحالی، مہنگائی اور دیوالیہ پن سے اتنا ڈرایا ہے کہ جان پر کنز کی کتابوں کا حوالہ دینے والا عمران، انہی معاشی غارت گروں (Hitmen) کے شکنجے میں آ چکا ہے۔

کاش کوئی اسے بتا دے کہ دنیا میں کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے جس نے آئی ایم ایف پروگرام میں داخل ہوکر خوشحالی کی راہ اختیار کی ہو۔ سب کے سب بدحال ہوئے، قرض میں جکڑے گئے، بدترین معاشی بحران کا شکار ہوئے۔ .....عوام کا رونا تو اب بھی ہے اور اسکے بعد بھی رہے گا۔ لیکن اگر آپ ان ملکوں کی راہ اختیار کرتے جنہوں نے قرضوں کا آڈٹ کروایا، غیر اخلاقی قرضے دینے سے انکار کیا تو شاید کچھ عرصہ عوام اور روتے رہتے، لیکن اسکے بعد انکی زندگی پرسکون ہوتی، باعزت اور باغیرت ہوتی۔

محمد موسیٰ بھٹو

علم

تعمیر سیرت کا ذریعہ یا حجابات کا؟

زیر نظر مضمون ہمارے پچھلے ماہ چھپنے والے دعوتی خط ہی کا تسلسل ہے، جس میں علم ہی کو حرف آخر قرار دینے والے بعض جدید اسلامی اسکالروں کی فکر سے متاثر افراد کے سامنے کچھ معروضات پیش کی گئی ہے۔

اسلام میں یقیناً علم کی بڑی اہمیت ہے۔ قرآن کی پہلی وحی اقراء باسم میں علم ہی کی تاکید فرمائی گئی ہے، قرآن میں دوسری جگہ اہل ایمان کے ساتھ اہل علم کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے کہ اللہ ان کے درجات بلند فرماتا ہے۔

لیکن علم، استدلال اور عقل کو جب تزکیہ وتقویٰ کے متوازی حیثیت سے پیش کیا جائے، جس طرح اس وقت جدیدیت سے متاثر بعض اسلامی اسکالر پیش گر رہے ہیں تو اس وقت تزکیہ، معرفت اور اللہ سے محبت کی حیثیت کو اجاگر کرنا ضروری ہوجاتا ہے، تاکہ علم وعقل واستدلال کی یہ حیثیت کہ وہ تزکیہ کے تابع ہے، اجاگر ہو۔

مضمون پڑھتے وقت اس توضیح کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، ہم ان غالی اور جاہل صوفیاء کی علم دشمنی کے مخالف ہیں، جو تصوف کو قرآن وسنت کے دائرہ سے نکال کر، اسلامی شریعت سے بے نیازی کی راہ پر گامزن ہیں، لیکن ساتھ ساتھ ہم جدید اسکالروں کی طرف سے علم ہی کو حرف آخر قرار دینے اور علم کو تزکیہ پر ترجیح کی روش کو بھی غلط سمجھتے ہیں۔ **(ادارہ)**

علم کا سب سے بڑا ہدف معرفت نفس اور معرفت رب ہے، تاکہ فرد اس دنیا میں اپنے مولا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی صلاحیتوں کا حامل ہوسکے، معرفت نفس کی صلاحیت نہ ہوگی تو ہولناک نفسی قوتوں اور اس کی خفیہ تہوں سے آشنائی اور اس سے بچاؤ کی صورت پیدا نہ

ہوگی، معرفت نفس یعنی اپنی خودی سے آشنائی سے معرفت رب کی صورت پیدا ہوگی۔

آج کل کے علم کا ہدف عام طور پر علم برائے علم، علم برائے معاش، علم برائے شہرت یا علم برائے حصولِ دولت بن گیا ہے۔

قرآن میں اہل علم کی علامت ہی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں، حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص علم اس لئے حاصل کرتا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ سے اہل علم کا ناطقہ بند کرے، یا اس کے ذریعہ سے شہرت حاصل کرے تو ایسا فرد جہنم میں داخل ہوگا۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے، اسے نیا علم عطا فرمایا جاتا ہے۔

علم دراصل عمل صالح کی صلاحیت کا ذریعہ ہی ہے، علم کی غرض وغایت اور اس کی اصل روح یہی ہے۔

تزکیہ سے محروم علم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس سے علمی برتری کے زہریلے اثرات غیرمحسوس طور پر شخصیت میں داخل ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ اگر فرد بروقت بیدار ہو کر، تزکیہ کی طرف چلنا شروع ہوا تو ٹھیک ہے، دوسری صورت میں علمی برتری یعنی تکبر شخصیت کا پوری طرح احاطہ کر لیتا ہے۔ اس کی علامتوں میں جو باتیں شامل ہیں، اس میں دوسروں کی تحقیر کا ہونا، ضد کی نفسیات کا غالب ہونا، نفس کے یرغمال شدہ عقل کا اسیر ہونا، حق اور حقیقت کے فہم کی راہ میں قلبی حجابات کا پیدا ہونا، معرفت سے خالی علم اور علمی گتھیوں کو سلجھانے میں قیمتی زندگی کو ضایع کرنا، رونقِ کردار سے محروم ہونا، زبان میں تیز سے تیز تر ہونا، دل کی خفتہ صلاحیتوں کی بیداری سے غافل ہونا، کتابی علم یا عقل سے حاصل ہونے والے علم کو حرف آخر سمجھنا وغیرہ وغیرہ۔

قرآن، اللہ کی ایسی کتاب ہے، جو فرد کی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے اور اس کے سیرت وکردار کی تعمیر اور اس میں تقویٰ پیدا کرنے کے لئے کافی وشافی ہے، اگر قرآن سے تعلق مستحکم ہوجائے تو فرد اس دنیا سے زیادہ دوسری دنیا یعنی آخرت کا انسان بن جاتا ہے اور اس کے تزکیہ کی صورت پیدا ہوتی جاتی ہے، قرآن کی اس فیصلہ کن اہمیت کے باوجود انسانی نفس کی ساخت کچھ ایسی ہے اور فرد کی شخصیت میں اس طرح کے بت نصب کئے گئے ہیں کہ اول تو قرآن سے تعلق قائم ہونا مشکل ہے، اگر کسی طرح تعلق قائم بھی ہو تو عام طور پر فرد کا تزکیہ نہیں ہو پاتا اور تقویٰ کی راہ ہموار نہیں ہو پاتی، اس لئے اللہ نے آیات کی تلاوت، کتاب کی تعلیم اور حکمت کی تعلیم کے ساتھ تزکیہ کا الگ سے ذکر کیا ہے، قرآن کی یہ آیت الفاظ کے معمولی تغیر سے چار مختلف مقامات پر آئی ہے، جس میں پیغمبر کی بعثت کے مذکورہ مقاصد بیان فرمائے گئے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کے بعد یہ چاروں مقاصد امت کی مختلف شخصیتوں کی طرف منتقل ہوئے، جب کہ تزکیہ کا کام مزکیوں اور مربیوں نے سنبھالا، قرآن کی مذکورہ آیت سے بعض مفسروں جن میں حکیم الامت مولانا تھانویؒ بھی شامل ہیں، لکھا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کے علاوہ ایک اور علم بھی ہے اور وہ تزکیہ کا علم ہے، جو اہل اللہ کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔

اہل اللہ کے ہاں اس بات کا خصوصی اہتمام رہا ہے کہ کثرتِ ذکر کے ساتھ قرآن کی تلاوت اور معنیٰ کے ساتھ اس کے پڑھنے کی تاکید کی جاتی ہے، تاکہ عبرت وموعظت حاصل ہوسکے۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ جو علماء تزکیہ کے لئے اہل اللہ کی طرف رجوع ہو کر، ذکر وفکر کے مجاہدوں سے غافل رہے، وہ عام طور پر علمی برتری، جذبہ شہرت اور نفس اور دنیا کے اسیر رہے، ان کی سیرت وکردار میں پاکیزگی پیدا نہ ہوسکی، نیز وہ افراد معاشرہ پر اثر انداز نہ ہوسکے۔

سبب ظاہر ہے کہ نفس کی ہولناک قوت محض علم سے قابو نہیں ہوتی، اس کی اصلاح کے لئے ظاہری علم اور علم کی ظاہری سطح کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے قرآن سے حقیقی استفادہ کے لئے تقویٰ کو لازم قرار دیا گیا ہے **"ھدی للمتقین،"** قرآن میں دوسری جگہ ہے **" ان فی ذالک لذکریٰ لمن کان لہ قلب"** (اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لئے جس کا قلب (زندہ ہے) قلب میں اگر تقویٰ، خشیت، انابت، رجوع الی اللہ اور اللہ سے محبت کے میلانات موجود نہ ہوں گے تو قرآن زندگی میں حقیقی تبدیلی پیدا کرکے، اللہ کے رنگ کو غالب کرنے میں خاص کردار ادا نہیں کرسکتا۔

اہل اللہ کے ہاں تزکیہ کے لئے صحبت کے نظام کے ساتھ ساتھ ذکر کے مجاہدوں کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے، جس سے قلب کی زندگی اور اس کی سلامتی کی صورت پیدا ہوتی ہے اور قرآن سے حقیقی اخذ فیض کی صلاحیت ابھرتی ہے، علمی طبقہ عام طور پر صحبت اور ذکر کے مجاہدوں سے بچنے کے لئے علم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے کہ قرآن وسنت کے علم کے بعد آخر دوسری چیزوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ ضرورت دراصل یہی ہے کہ علم کے ساتھ جو علمی حجابات،

علمی برتری کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں، جو اغوائے نفسانی اور اغوائے شیطانی کا موجب بنتے ہیں، ان حجابات سے نجات کی صورت پیدا ہو۔

قرآن نے صحبت اور ذکر پر زور دیا ہے، "**یاایھا الذین آمنو کونوا مع الصادقین**" (اے ایمان والو صادقین کی صحبت اختیار کرو)۔

ذکر کے بارے میں تو قرآن میں سب سے زیادہ زور دیا ہے، "**استحوذ علیھم الشیطان فانساھم ذکر اللہ**" (شیطان نے ان پر غلبہ پالیا ہے (اس کی علامت کیا ہے؟ اس کی علامت یہ ہے کہ) اس نے ان سے اللہ کا ذکر ان سے بھلا دیا ہے) یعنی اللہ کے ذکر سے انہیں دور کردیا ہے۔

"**ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین**" (جو رحمٰن کے ذکر سے اندھا ہوجاتا ہے اس پر شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے جو اس کا مستقل ساتھی ہوتا ہے)۔

علم کے نام پر تزکیہ اور تزکیہ کے ذرائع صحبت اہل اللہ اور ذکر کے مجاہدوں سے راہ فرار اختیار کرنا، بلکہ ان چیزوں کو غیر ضروری اور بے معنیٰ قرار دینا اور ان کی طرف میلان کا بالکل نہ ہونا، یہ اس دور کے علمی طبقے کا سب سے بڑا المیہ ہے، یہ دراصل علمی برتری ہی کی صورت ہے۔

شیطان، علم وعبادت کے باوجود محض تکبر کی وجہ سے راندہ درگاہ ہوا، اس لئے بزرگان دین نے تقویٰ، تزکیہ، اور خشیت سے خالی علم کو حجاب اکبر کہا ہے۔

آج معاشرے میں علمی طبقہ اسلام کے حوالے سے قابل ذکر کردار ادا کرنے سے اس لئے قاصر ہے کہ وہ امت کے تسلسل یعنی صحبت اہل اللہ اور ذکر کے مجاہدوں سے تہذیب نفس کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں اور علم ہی کو سب سمجھنے کا حامل ہے، بزرگوں کی تصریح کے مطابق حالت یہ ہے کہ فرد جوں جوں علم میں آگے بڑھتا ہے، اسی حساب سے خود سری، خود رائی اور انانیت کا مریض بن جاتا ہے، دوسروں کی اصلاح تو دور کی بات ہے، اپنی اصلاح کا عمل ہی مشکل ہوجاتا ہے، اس طرح کی صورتحال میں نافع علم حاصل ہو تو کیسے ہو؟ اللہ کے رسول ﷺ کے دعا کے الفاظ ہیں "**اللھم فتح اقفال قلوبنا بذکرک**" (اے اللہ ہمارے دل کے تالوں کو اپنے ذکر کے لئے کھول دیئے)۔

بدقسمتی سے اس دور میں صحبت اور ذکر کے کام کو سب سے کم تر اور غیر ضروری کام سمجھا گیا ہے، اور یہ بات کرنے والوں پر صوفیت کی پھبتی کسی جاتی ہے۔

بات بالکل واضح ہے کہ جب تک علم کو سلف صالحین کی روایت اور ان کی توضیح وتشریح سے ہمہ آہنگ نہیں کیا جائے گا، تب تک علم، افراد اور معاشرے کے لئے کارآمد ثابت نہ ہوگا اور علمی مزاج کے حامل افراد اپنی ذات اور معاشرے کے لئے باعث خیر وبرکت ثابت نہ ہوسکیں گے۔

سلف صالحین کی علمی روایت یہی ہے کہ علم کے ساتھ تقویٰ، خشیت، اللہ سے محبت، اس کی معرفت، تزکیہ کے حصول کی کاوشیں وغیرہ جزو لاینفک رہی ہیں۔

علم کی آخری سطح نور تک رسائی ہے، "**یھدی اللہ لنورہ من یشاء**" (اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور سے فیضیاب فرماتا ہے) "**یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وآمنوا برسلہ یوتکم کفلین من رحمتہ ویجعل لکم نورا تمشون بہ**" (اے ایمان والوں اللہ سے تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تو تمہیں رحمت کے دو حصے عطا کئے جائیں گے اور تمہیں ایسا نور عطا کیا جائے گا جس میں تم چلو پھرو گے)۔

اہل اللہ کی ساری ریاضتوں کا حاصل اس نور تک رسائی ہی ہے، جو تقویٰ، تزکیہ، نفسی بتوں سے بڑی حد تک نجات اور نفسی قوتوں کے خلاف عرصہ تک معرکہ آرائی سے ہی حاصل ہوتا ہے، اسے نسبت مع اللہ کے حصول کا نام بھی دیا جاتا ہے، جب نسبت مع اللہ ایک حد تک بھی حاصل ہوجاتی ہے تو اس کے بعد قرآن کی تلاوت اور اس پر غور وفکر، فرد کو لرزا دینے اور قیامت میں حساب کتاب کے حوالے سے اسے بے قرار کردینے کا موجب بنتا ہے۔

اس دور میں پچھلے ستر سال سے مولانا وحید الدین خان نے علم کے حوالے سے نئے علم الکلام پر مشتمل لٹریچر تیار کیا ہے، بلکہ ایک کتب خانہ تیار کیا ہے، ان کے لٹریچر میں پھر بھی اخلاقیات، خود احتسابی، اصلاح نفس اور فکر آخرت پر زور ہے، لیکن چونکہ وہ خود بھی صحبت اہل اللہ سے دور رہے اور اپنی تحریروں میں بھی اس کی مخالفت کرتے رہے، اس لئے ان کا لٹریچر اور ان کی شخصیت، سلف سے جداگانہ راہ اختیار کرنے اور امت کے سارے گروہوں سے ٹکرانے کا موجب

بن گئی، اب بیسویں صدی میں اسلام کے حوالے سے علم کو حرف آخر قرار دینے والے جو اسکالر سامنے آئے ہیں، ان کی شخصیت اور ان کے علم میں سرے سے اخلاقیات کا کوئی معیار ہی موجود نہیں، علم برائے علم، گفتگو برائے گفتگو، بزرگان دین، علمائے ربانیں اور سلف صالحین کی تردید وتکذیب اور ان کی مخالفت ان کا وظیفہ ہے، چونکہ ان کا مطالعہ وسیع ہے، وہ خطیبانہ صلاحیتوں کے حامل ہیں، اس لئے وہ خالی ذہن یا سطحی مطالعہ کے حامل افراد کو اپنے ساتھ بہا کرلے جانے کا ذریعہ بن رہے ہیں، اس طرح کے افراد کی کوششوں کا حاصل علم کے نام پر معاشرے میں سیرت وکردار کے بحران کو فروغ دینا ہے، ان کو الیکٹرانک میڈیا کی سہولت حاصل ہے، اس کی وجہ سے محبت ومعرفت سے خالی اس علمی رجحان (جس میں سلف دشمنی شامل ہے) کو روکنا دشوار ہے۔

علم کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ عبادات، معاملات، معاشرت اور مسائل زندگی کے بارے میں شریعت کے احکامات کا علم حاصل ہو، اس علم میں مہارت تو علمائے کرام ہی کو حاصل ہوسکتی ہے، جو برسہائے برس تک اپنا وقت ان علوم کے حصول میں صرف کرتے ہیں، ان معاملات میں تھوڑا بہت علم مطالعہ سے ہمیں بھی حاصل ہوسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود فقہی معاملات میں علماء سے رجوع کئے بغیر چارہ کار نہیں، ان سارے معاملات میں میڈیا سے وابستہ اسلامی اسکالروں پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا، یہ کہنا کہ الیکٹرانک میڈیا میں معلومات کا ایک سمندر آیا ہوا ہے، اس لئے جدید انسان کو دینی معاملات میں علماء کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، وہ میڈیا سے بآسانی ہر طرح کی دینی معلومات حاصل کرکے دینی رہنمائی حاصل کرسکتا ہے، یہ نکتہ نگاہ غلط ہے، اس لئے کہ جدید اسکالر کا ذہنی سانچہ، مغربی فکر سے مرعوبانہ بنیاد پر متشکل ہوتا ہے، ان معاملات میں دینی معلومات کے حصول کے لئے ان پر اعتماد کا مطلب غیر شعوری طور پر اسلام کی جدید ایڈیشن سے ہمہ آہنگی یا جدیدیت سے تاثیر پذیری کی صورت میں ہی ظاہر ہوسکتا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس سلسلے میں احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے ذہین باصلاحیت افراد اسلامی معلومات کے حوالے سے اپنے آپ کو مطلق مجتہد کے مقام پر فائز سمجھنے لگتے ہیں، اور وہ اس ذہن کے حامل ہوجاتے ہیں کہ انہیں خیر جہاں سے بھی حاصل ہو، چاہے مرزا غلام محمد قادیانی سے حاصل ہو یا غلام احمد پرویز صاحب سے، اسے حاصل کرنا چاہئے، حالانکہ ہر ایک سے خیر کے حصول کے لئے غیر معمولی تقابلی مطالعہ کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہوتا ہے، دوسری صورت میں فرد علم کے نام پر گمراہ گروہوں کی نذر ہونے سے نہیں بچ سکتا۔

یہ دراصل مجتہد بننے کی راہ ہے، جو فرد کو سلف وخلف سے دور کرکے، اپنی ذات کا اسیر بنا دیتی ہے، حالانکہ مجتہد بننے کے لئے برسوں تک ماہرینِ علوم کی صحبت اختیار کرنی پڑتی ہے اور زندگی کا طویل عرصہ علم میں غوطہ زن ہوکر، علوم کی گہرائیوں تک پہنچنا ہوتا ہے، اس کے بعد بھی بمشکل خوش نصیب افراد ہی اجتہادی صلاحیتوں تک پہنچتے ہیں۔

علم کی ایک سطح انسانی فطرت میں ودیعت شدہ توحید، اللہ سے والہانہ محبت اور خیر وشر کے علم کی بھی ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا، بچہ دین اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر ماں باپ اسے عیسائی، مجوسی یا یہودی وغیرہ بنا دیتے ہیں، قرآن میں اسی فطرتی علم کے بارے میں فرمایا گیا ہے **فطرت اللہ التی فطرت الناس علیھا** (یہی اللہ کی فطرت ہے، جس پر انسان کو پیدا فرمایا گیا ہے)۔

قرآن میں دوسری جگہ ہے **بل ھو آیۃ بینۃ فی صدور الذین اوتو العلم** (بلکہ یہ واضح آیتیں (نشانیاں) اہل علم (اہل معرفت) کے سینے میں پہلے سے موجود ہیں)۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت سلیمہ ایسی چیز ہے، جس میں وہ سارے نقوش موجود ہیں، جن کے ذریعہ فرد اللہ سے محبت کے ارتقائی مراحل طے کرکے، اپنی پوری زندگی اس کی مرضی کے مطابق گزار سکتا ہے، لیکن انسان کو عام طور پر ہر دور میں مادیت پرستی اور نفس پرستی کا جو ماحول ملا ہے، وہ اسے فطرت سلیمہ سے دور کرکے، اس میں مادیت کی روح کو غالب کرنے اور اس میں موجود رحمانی قوتوں پر مادی قوتوں کو فاتح کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

موجودہ دور میں تو بچے کو جو ماحول ملا ہے، وہ مادیت پرستی کا ہمہ گیر وہمہ جہتی ماحول ہے، موبائل کے ذریعہ ساری دنیا کا مادی حسن اس کے سامنے ہے، اس حسن پر فدائیت کے میلانات اس پر اتنے غالب ہیں کہ فطرت سلیمہ مسخ ہوکر رہ جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اگر مختصراً الفاظ میں انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد بیان کرنے کے لئے کہا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ فطرت میں موجود اللہ سے والہانہ محبت کا جو داعیہ فرد کے اندر موجود ہے، جسے تعلیم وتربیت کا ماحول دبا دیتا ہے، اسے بیدار کرکے ارتقائی صورت دی جائے اور اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا ملکہ راسخ کیا جائے۔

اللہ کی محبت سے جب فطرت میں ودیعت شدہ شروخیر کے احساسات بیدار وطاقتور ہوتے ہیں تو فطرت سے وہ علوم سامنے آتے ہیں، جو قرآن میں موجود ہیں، فطرتی علوم عین قرآن سے مطابقت رکھتے ہیں اور دین پر عمل پیرا ہونے کی استعداد کا ذریعہ بھی بنتے ہیں، اس طرح نفسی حجابات سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

لیکن بدقسمتی سے اس دور میں معلومات کا یہ فطرتی ذریعہ سب سے زیادہ کمزور ہوا ہے، معلومات کے اس ذریعے سے استفادہ کی صورت لگ بھگ مفقود ہوگئی ہے، دور جدید کے مادیت پرستی پر مبنی علوم اور نظریات وفلسفہ نے جہاں ہم سے اور بہت ساری چیزیں سلب کی ہیں، وہاں اس نے فطرت سلیمہ میں موجود علوم کی وسیع دنیا سے بھی ہمیں محروم کیا ہے، اہل اللہ کی صحبت کے ذریعہ اللہ کی محبت کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد فطرت کے یہ میلانات بیدار اور طاقتور ہوتے ہیں، جس سے فرد کے اندر یہ طاقتور احساس پیدا ہوتا ہے کہ اللہ سے قرب کا داعیہ تو اس کے اندر میں موجود تھا، اس نے اس طاقتور داعیہ کو نظر انداز کیا، جس کی وجہ سے وہ علم کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا، اسے علم کی ظاہری سطح تو مل سکی، جب کہ وہ علم کی روح سے محروم رہا، جس طرح فرد بادام کے مغز کی بجائے اس کے چھلکے ہی کو اصل سمجھنے لگے، یہی صورتحال یہاں ہے۔

قرآن سے حقیقی علوم حاصل کرنے کی صلاحیت بھی دراصل فطرت میں موجود محبوب حقیقی سے محبت کے طاقتور داعیہ کو بیدار کرنے سے ہی حاصل ہوتی ہے، مولانا رومی نے بجا فرمایا ہے۔

بنی اندر علوم انبیاء
بے معید وبے کتاب وبے اوستا

زکوٰۃ کی مد فی سبیل اللہ کی تعریف وتفصیل

جدید دور کے چیلنج کے پس منظر میں

قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں سبیل اللہ کی تشریح میں لکھتے ہیں ''سبیل اللہ کے لفظ کو نہ صرف جہاد (بمعنیٰ قتال) کے لئے مخصوص قرار دیا جائے، نہ حج کے لئے، خواہ کوئی مصرف خیر (خیر کا کوئی بھی کام) ہو، سب کو یہ لفظ شامل ہے، لہٰذا غریب طلبہ کو جو زکوٰۃ دیتے ہیں، وہ بھی فی سبیل اللہ ہی کے ذیل میں آتا ہے۔ (تفسیر مظہری جلد پنجم صفحہ ۳۲۱)

سید رشید رضا (جو مصر کے ممتاز عالم ہیں وہ) اپنی تفسیر ''المنار میں لکھتے ہیں:

''فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے تعلق سے موجودہ زمانہ میں اہم ترین کام یہ ہے کہ اسلام کے لئے داعی تیار کئے جائیں، اور ان کی وافر مدد کی جائے۔

جس طرح کہ کفار اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے کرتے ہیں۔ (تفسیر منار، جلد اول صفحہ ۵۸۵)

سید صدیق حسن خان (جو اہل حدیث مکتبہ فکر کے سب سے بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں جو اہل اللہ سے پوری طرح فیضیاب تھے) وہ لکھتے ہیں:

یہاں سبیل اللہ سے مراد اللہ کی راہ ہے اور جہاد اگرچہ اللہ کی سب سے بڑی راہ ہے، لیکن اس مد کو جہاد کے لئے مخصوص قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ ہر ایسے کام پر صرف کرنا صحیح ہے، جو اللہ کی راہ کے مفہوم میں ہو) مزید لکھتے ہیں۔

جو علماء مسلمانوں کے دینی مفادات کی خدمت سرانجام دے رہے ہوں، ان پر خرچ کرنا بھی من جملہ فی سبیل اللہ ہے، کیونکہ اللہ کے مال میں ان کا بھی حصہ ہے، خواہ وہ غنی ہوں یا محتاج، بلکہ اس مقصد میں خرچ کرنے کی زیادہ اہمیت ہے، کیونکہ علماء انبیاء کے وارث اور دین کے حامل ہیں۔ اور ان ہی کے ذریعہ ملت اسلامیہ اور شریعت محمدیہ کا دفاع وتحفظ کا کام ہوسکتا ہے۔ (الروضۃ الندیۃ، جلد اول صفحہ ۲۰۶)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ صاحب فی سبیل اللہ کے تشریح میں لکھتے ہیں:

''اور صاحب بدایع نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہے اور اس کی ادائیگی میں مال کی ضرورت ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے، بشرطیکہ اس کے پاس اتنا

مال نہ ہو، جس سے وہ اس کام کو پورا کر سکے، جیسے دین کی تعلیم وتبلیغ اور ان کے لئے نشر واشاعت (کا کام) کہ اگر کوئی مستحق زکوٰۃ یہ کام کرنا چاہے تو اس کی امداد مالِ زکوٰۃ سے کردی جائے، مگر مالدار صاحب نصاب کو نہیں دیا جا سکتا۔ (معارف القرآن جلد۴ صفحہ۴۰۷)

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

لفظی معنیٰ کے اعتبار سے اس میں ہر وہ خرچ آجاتا ہے، جو اللہ کی رضا جوئی کے لئے کیا جائے، لیکن مفسرین نے احادیث نبوی اور آثار صحابہ کی روشنی میں خرچ کی اس مد کو مجاہدین تک محدود رکھا ہے۔''

''بعض فقہا نے یہاں تک توسیع سے کام لیا ہے کہ طاعت الٰہی میں ہر قسم کی جدوجہد کرنے والوں کو اس میں داخل کر دیا ہے۔ (تفسیر ماجدی جلد دوم صفحہ ۳۷۱)

مولانا ابو الکلام آزاد اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں لکھتے ہیں:

فی سبیل اللہ کا مفہوم ہے۔ یعنی جہاد کے لئے اور ان تمام کاموں کے لئے جو مثل جہاد کے اعلائے کلمہ حق کے لئے ہوں۔ (جلد دوم صفحہ ۱۳۳)

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ''تدبر قرآن'' میں لکھتے ہیں۔

وفی سبیل اللہ یہ ایک جامع اصطلاح ہے۔ جس کے تحت جہاد سے لے کر دعوت دین اور تعلیم دین کے سارے کام آجاتے ہیں، وقت اور حالات کے لحاظ سے کسی کام کو زیادہ اہمیت حاصل ہوجائے گی، کسی کو کم، لیکن جس کام سے بھی اللہ کے دین کی کوئی خدمت ہو، وہ فی سبیل اللہ کے حکم میں داخل ہوگی۔ (تدبر قرآن، جلد سوم صفحہ ۵۹۳)

مولانا مودودی لکھتے ہیں:

راہ خدا کا لفظ عام ہے، تمام نیکی کے کام، جن میں اللہ کی رضا ہو، اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ ائمہ سلف کی بڑی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی وہ جدوجہد، جس سے مقصود نظام کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظام اسلامی کو قائم کرنا ہو، اس جدوجہد میں جو لوگ کام کریں، ان کو سفر خرچ کے لئے، سواری کے لئے، آلات واسلحہ اور سامان کی فراہمی کے لئے زکوٰۃ سے مدد دی جا سکتی ہے، خواہ وہ بجائے خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لئے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اسی طرح جو لوگ رضا کارانہ اپنی تمام خدمات اپنا تمام وقت، عارضی طور پر یا مستقل طور پر اس کام کے لئے دیدیں، ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی زکوٰۃ سے وقتی واستعمراری اعانتیں دی جا سکتی ہیں۔

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ائمہ سلف کے کلام میں بالعموم اس موقعہ پر غزوہ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو قتال کا ہمہ معنیٰ ہے، اس لئے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف میں فی سبیل اللہ کی جو مد رکھی گئی ہے، وہ صرف قتال کے لئے مخصوص ہے، لیکن درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ قتال سے وسیع تر چیز کا نام ہے۔ اور اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے، جو کلمہ کفر کو پست اور کلمہ خدا کو بلند کرنے اور اللہ کے دین کو نظام زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کے لئے کی جائیں، خواہ وہ دعوت وتبلیغ کے ابتدائی مرحلہ میں ہوں یا قتال کے آخری مرحلہ میں۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۲۰۸)

یوسف القرضاوی صاحب نے ''فقہ الزکوٰۃ'' میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اس بحث کا ایک حصہ یہاں دیا جارہا ہے۔

''یوں دیکھا جائے تو سبیل اللہ میں اس کے عام معنی کے لحاظ سے فقراء ومساکین کی معاونت بھی شامل ہے۔ اور بقیہ اصناف بھی، کیونکہ یہ سب نیکی اور طاعت ہی کے کام ہیں۔ پھر اس مصرف میں اور دیگر بیان کردہ مصارف میں ایک فرق رہ جاتا ہے؟

اللہ کا کلام نہایت بلیغ اور معجزانہ شان کا ہے، اس لئے اس میں بے فائدہ تکرار نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے خاص معنیٰ مراد لئے جائیں، جو بقیہ مصارف سے مختلف ہوں۔ یہی معنی ہیں جو زمانہ قدیم سے مفسرین اور فقہاء سمجھتے آئے ہیں۔ انہوں نے سبیل اللہ سے جہاد مراد لیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ جب یہ لفظ مطلقا استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے یہی معنی ہوتے ہیں، اس لئے ابن اثیر کہتے ہیں کہ یہ لفظ جہاد کے معنی میں اس کثرت سے استعمال ہوتا ہے کہ گویا اس کے صرف یہی معنی ہیں۔ بکثرت احادیث صحیحہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سبیل اللہ کے متبادر معنی جہاد ہی ہیں۔ مثلا۔

لغدوة فی سبیل الله او روحة خیر من الدنیا وما فیها. (بخاری ومسلم)

''اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام دنیا وما فیہا سے بہتر ہے۔''

ما اغبرت قدما عبد فی سبیل الله فتمسة النار. (بخاری)

''جس بندے کے پاؤں اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوں گے اس کو آگ نہیں چھوئے گی۔''

ان احادیث میں لفظ سبیل اللہ کا مطلب جہاد کے سوا کسی نے کچھ اور نہیں سمجھا۔ یہ تمام قرائن اس بات کو ترجیح دینے کے لئے کافی ہیں کہ مصارف والی آیت میں سبیل اللہ سے مراد جہاد ہے، جیسا کہ جمہور کا قول ہے۔ اور اصل لغوی معنی مراد نہیں ہیں۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ صدقہ کسی غنی کے لئے جائز نہیں ہے، مگر پانچ اشخاص

کے لئے۔ ان پانچ اشخاص میں الغازی فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں لڑنے والا) کا بھی ذکر ہے۔

اس لئے میں سبیل اللہ کا مدلول متعین کرنے میں ایسے توسع کا قائل نہیں کہ ہر قسم کے مصالح اور تقرب کے کام اس میں شامل ہوجائیں اور نہ ہی اس کے دائرہ کو اتنا تنگ سمجھتا ہوں کہ وہ صرف عسکری جہاد کے لئے خاص ہوکر رہ جائے۔

جہاد جس طرح تلوار اور نیزہ سے کیا جاتا ہے، اس طرح زبان اور قلم سے بھی کیا جاتا ہے اور جس طرح جہاد عسکری ہوتا ہے، اسی طرح جہاد فکری، تربیتی، اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی بھی ہوتا ہے۔ جہاد کی ان تمام قسموں کے لئے مال اور امداد کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہمت اس بات کی ہے کہ بنیادی شرط پوری ہو اور وہ یہ ہے کہ جہاد، اللہ کی راہ میں ہو یعنی اسلام کی نصرت اور اس کے کلمہ کو بلند کرنے کی غرض سے ہو۔ اور ہر وہ جہاد، جس کا مقصد اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا ہو، اللہ کی راہ میں ہے، خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو۔

امام طبری ''وفی سبیل اللہ'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

یعنی اللہ کے دشمنوں سے قتال کرتے ہوئے اس کے دین اور اس کی شریعت کی نصرت میں خرچ کرنا۔ اور یہ کفار سے جنگ کے مترادف ہے۔

شیخ المفسرین کے بیان کا ایک جزء واضح اور قابل قبول ہے، یعنی اسلام کی ضرورت اور اس کی شریعت کی حمایت میں خرچ کرنا۔ رہا دوسرا جزء یعنی دشمنان خدا سے قتال اور کفار سے جنگ تو یہ دین کی نصرت کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت ہے، بعض حالات میں دین کی نصرت کے لئے جنگ قتال ہی کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، بلکہ بعض ادوار اور بعض ممالک میں نصرت دین کی یہی شکل متعین ہوتی ہے لیکن ایک ایسا دور بھی آتا ہے جیسا کہ ہمارا دور ہے، جس میں فکری اور نفسیاتی جنگ زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور مادی اور فوجی جنگ کے مقابلہ میں اس کے اثرات زیادہ گہرے مرتب ہوتے ہیں۔

مسالک اربعہ کے جمہور فقہاء نے اس مد کو غازیوں اور دفاعی خدمت انجام دینے والوں کو سامان حرب سے لیس کرنے اور ان کی ضروری امداد کرنے کی حد تک رکھا ہے، لیکن ہم موجودہ زمانہ میں دوسری قسم کی جنگ کرنے والوں اور دفاعی خدمت انجام دینے والوں کا اضافہ کرتے ہیں، یعنی ان لوگوں کا، جو اسلام کی تعلیمات اور دعوت اسلامی کے ذریعہ دل ودماغ پر حملہ آور ہوتے ہیں، یہی لوگ اپنی جدوجہد، اپنی زبان اور اپنے قلم کے ذریعہ اسلام کے عقائد اور اس کے شرعی احکام کے دفاع کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔ جہاد کا یہ وسیع مفہوم ہمارے نزدیک درج ذیل دلائل پر مبنی ہے۔ (فقہ الزکوٰۃ صفحہ ۳۹۷۔۳۹۸)

''اولاً'' اسلام میں جہاد تلوار سے جنگ تک محدود نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث صحیح ہے کہ نبی ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا جہاد افضل ہے تو آپؐ نے فرمایا:

کلمة حق عند سلطان جائر.

''حق بات جو کسی ظالم سلطان کے سامنے کہی جائے۔''

اسی طرح صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ما من نبی بعثه الله فی امتی قبلی الا کان له من امة حواریون واصحاب یاخذون بسنة ویقتدون بامره ثم انها تخلف من بعدهم خلوف یقولون مالا یفعلون ویفعلون ما لایؤمرون فمن جاهدهم بیده فهو مؤمن ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن، ومن جاهدهم بقلبه فهو مومن. ولیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل.

''مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا تو اس کے کچھ مخلص ساتھی اور رفقاء ہوئے، جو اس کی سنت کو لیتے اور اس کے احکام کی اتباع کرتے، لیکن بعد میں ایسے ناخلف لوگ آتے ہیں، جو وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں اور وہ کام کرتے ہیں جن کے کرنے کا انہیں حکم نہیں دیا گیا۔ تو جو شخص ایسے لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو اپنی زبان سے جہاد کرے وہ بھی مومن ہے اور جو اپنے دل سے جہاد کرے وہ بھی مومن ہے۔

اس کے بعد رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہتا۔''

نیز فرمایا:

جاهدوا المشرکین باموالکم وانفسکم والسنتکم.

''مشرکین سے جہاد کرو اپنے مال، اپنی جان اور اپنی زبان سے۔'' (احمد، ابو داؤد، نسائی)

ثانیا جہاد کی جو قسمیں ہم نے بیان کی ہیں، وہ اگر منصوص طور پر جہاد کے حکم میں داخل نہ ہوں تو قیاسا ان کو جہاد سے متعلق ماننا پڑے گا، کیونکہ دونوں ہی کا مقصود اسلام کی نصرت، اس کا دفاع، اس کے دشمنوں کا مقابلہ اور اللہ کے کلمہ کو اس کی زمین پر بلند کرنا ہے بعض فقہائے اسلام نے عاملین میں ان لوگوں کو بھی شامل کیا ہے، جو مسلمانوں کے عام مفاد سے متعلق کوئی خدمت انجام دیں۔ اس طرح سبیل اللہ کے معنی کے بارے میں ہم نے جو رائے قائم کی ہے، وہ درحقیقت اپنے مدلول میں قدرے توسع کے ساتھ جمہور ہی کی رائے ہے۔

یہاں ہم اس بات پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ بعض کام اور منصوبے ایسے ہوتے ہیں جو کسی ملک، کسی دور اور کسی حالت میں جہاد فی سبیل اللہ قرار پاتے ہیں، لیکن کسی دوسرے ملک، دوسرے زمانہ یا دوسری حالتِ میں ان کی یہ حیثیت نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی مدرسہ کا قیام عام حالات میں ایک نیک کام ہے، جو اسلام کی نظر میں قابل قدر ہے، لیکن وہ اسے جہاد قرار نہیں دیتا، مگر جب کسی ملک میں تعلیم اور تعلیمی ادارے مشنریز یا کمیونسٹوں یا لادینیت کے علمبرداروں کے قبضہ میں ہوں تو ایسی صورت میں خالص دینی مدرسہ کا قیام، جس میں مسلمان بچے تعلیم حاصل کریں

اور انہیں فکری اور اخلاقی بگاڑ اور مروجہ تعلیمی نصاب کے زہریلے اثرات اور نظام تعلیم کی خرابیوں سے بچایا جا سکے، بہت بڑا جہاد قرار پائے گا۔(صفحہ ۳۹۸۔۳۹۹)

''عصر حاضر میں اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لئے جن سرگرمیوں کی ضرورت ہے اس کی چند مثالیں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ان کا شمار بجا طور پر فی سبیل اللہ میں کیا جا سکتا ہے۔

صحیح اسلام کو پیش کرنے کے لئے دعوتی مراکز قائم کرنا، جن کے ذریعۂ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ادیان ومذاہب کی کشمکش کے درمیان غیر مسلمین تک اسلام کا پیغام پہنچایا جا سکے، یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

اسلامی ممالک کے اندر ایسے اسلامی مراکز قائم کرنا بھی جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہے، جو مسلم نوجوانوں کی صحیح تربیت کریں، اسلام کے اعتدال پسندانہ نقطۂ نظر کے مطابق ان کی رہنمائی کریں۔ الحاد، فکری انحراف اور عملی بے راہ روی سے انہیں بچائیں اور انہیں اسلام کی حمایت ونصرت اور اس کے دشمنوں سے نبرد آزمائی کے لئے تیار کریں۔

اسی طرح خالص اسلامی پرچہ کا اجراء جو گمراہ صحافت کے درمیان اللہ کا کلمہ بلند کرنے، حق بات کا اظہار کرنے، اسلام پر عائد کئے جانے والے جھوٹے الزامات کی تردید کرنے، شبہات کا ازالہ کرنے، اور اسلام کو ہر قسم کی حاشیہ آرائی اور شائبوں سے پاک کر کے صحیح شکل میں پیش کرنے کی خدمت انجام دے، بلاشبہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ایسی دینی کتاب کی وسیع پیمانہ پر اشاعت، جو بنیادی اہمیت کی حامل ہو اور جو اسلام کو یا اس کے کسی پہلو کو اس خوبی کے ساتھ پیش کرے کہ اس کے پوشیدہ جواہر پر سے پردہ اٹھ جائے، اس کی تعلیمات کی خوبیاں نمایاں ہوں اور اس کے حقائق بے نقاب ہوں، جہاد فی سبیل اللہ کے مترادف ہے۔

پختہ کار، امانت دار اور مخلص افراد کو فارغ کرنا، تاکہ وہ دین کی خدمت کریں، اس کی روشنی کو چار دانگ عالم میں پھیلائیں، اس کے دشمنوں کی چالوں کو بے اثر کر کے رکھ دیں، فرزندان اسلام میں بیداری پیدا کریں اور عیسائی مشن، الحاد اور اباحیت کے طوفان کا مقابلہ کریں، من جملہ جہاد فی سبیل اللہ کے ہے۔ اور دین حق کے داعیوں کی معاونت کرنا، جن پر خارج سے اسلام دشمن طاقتیں داخلی عناصر۔ مرتد اور سرکش افراد کی مدد سے مسلط ہوجاتی ہیں اور انہیں طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دینے لگتی ہیں، ان کی معاونت کرنا، تاکہ وہ کفر اور سرکشی کے مقابلہ میں ثابت قدم رہیں، سراسر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ زکوٰۃ کے صرف میں ایسے کاموں کو اولین اہمیت دیں، کیونکہ اسلام کے مددگار اللہ کے بعد فرزندانِ اسلام ہی ہیں اور خاص طور ایسے دور میں، جبکہ اسلام غربت سے دوچار ہے۔ (فقہ الزکوٰۃ، صفحہ ۴۰۶ ۔ ۴۰۷)

محمد سلیم جباری

مہنگائی

اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی صورت

جان لیوا مسلط عذاب مہنگائی سے کوئی امیر ہے یا غریب، سبھی پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ پھل، سبزیاں اور دیگر اشیائے خوردونوش عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہیں۔ آمدنی اور تنخواہیں وہی جب کہ قیمتوں میں ہوش رُبا اضافہ ہو چکا ہے۔فصلوں کی تخمینے سے کم پیداوار اور شدید بارشوں کے باعث تباہی کی اس صورتِ حال میں گذران کی ڈوری کیوں کر قائم رکھی جا سکتی ہے، آیئے جائزہ لیتے ہیں۔

چونکہ مہنگائی کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہوئی، بلکہ اشیائے ضروریہ کی قلت کا سامنا ہر دور میں رہا ہے۔معلوم تاریخ کے مطابق سب سے بڑا قحط حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں پیش آیا۔ حکمرانِ وقت کو خواب میں رہنمائی ہوئی، جس کی حضرت یوسف علیہ السلام نے نہ صرف تعبیر کی، بلکہ تدبیر بھی فرمائی۔ وقت کے دستیاب وسائل بروئے کار لاتے ہوئے غلہ محفوظ کیا گیا، جو قحط کے سات برسوں کے لیے نہ صرف اہل مصر کے لیے کفایت کر گیا، بلکہ قرب جوار کی سلطنتوں نے بھی فائدہ اُٹھایا۔ قرآن مجید میں بیان شدہ اس خوب صورت واقعے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اختیارات اور ذمہ داریاں جب اہل لوگوں کو تفویض کی جائیں تو نتائج بہتر برآمد ہوا کرتے ہیں۔ نااہل اور سفارشی عناصر جب عہدوں پر مسلط کر دیے جائیں تو مہنگائی کا بے قابو ہوجانا حیرت کی بات نہیں ہوتی۔

عہدِ رسالت مآب ﷺ میں سب سے بڑی بحرانی کیفیت اس وقت پیش آئی، جب مسلمان اپنے وطن مالوف مکہ مکرمہ کو اللہ کی رضا کے لیے چھوڑ کر مدینہ منورہ پہنچے۔ وہ نفوس قدسیہ جب اپنے وطن کو خیر باد کہہ رہے تھے تو ان کی جائیدادیں، مال ومتاع اور جمع پونجی پر کفارِ مکہ نے قبضہ جما لیا تھا، حتیٰ کہ ایسے روح فرسا مناظر بھی پیش آئے کہ ہجرت کی غرض سے نکلنے والے مسلمانوں کے تن بدن کے کپڑے تک چھین لیے گئے۔ لٹے پٹے مسلمان جب مدینہ پہنچے تو رحمتِ

عالم ﷺ نے بحیثیت سربراہِ مملکت ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کا بھائی بنادیا، جسے ''مواخاتِ مدینہ'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ قانونی اور دینی رشتہ خون کے رشتوں کو بھی مات دے گیا اور شدید کسمپرسی کے عالم میں بھی حالات بے قابو نہ ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''اکیلے اکیلے نہ کھایا کرو، بلکہ مل کر ایک برتن میں کھاؤ۔ اس سے تمہارا ایک کا کھانا دو، دو کا چار اور چار کا آٹھ کے لیے کفایت کر جائے گا۔'' (صحیح مسلم، حدیث: ۲۰۵۹)

عہدِ صدیقی میں جب شدید قحط پڑا تو حضرت صدیق اکبرؓ ان دنوں نہایت پریشان دکھائی دیتے۔ عین ان دنوں میں حضرت عثمانؓ کا ایک ہزار اونٹوں کا لدا ہوا قافلہ مدینہ طیبہ پہنچا تو قرب وجوار کے تاجر آگے بڑھ بڑھ کر حضرت عثمانؓ کو منافع کی پیش کش کرنے لگے۔ آپؓ ان کی شرح منافع پر فقط یہی کہتے کہ مجھے اس سے کہیں زیادہ مل رہا ہے۔ تاجروں نے حیرت سے جاننا چاہا کہ وہ کون ہے جو ہم سب سے بڑھ کر منافع دے رہا ہے؟ تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا: مجھے ایک کے بدلے دس، بلکہ سات سو سے بھی زیادہ مل رہا ہے! اور ہزار اونٹوں پر لدا سازوسامان راہِ خدا میں صدقہ کردیا۔

عہدِ صحابہ کے اس واقعے سے رہنمائی ملتی ہے کہ اگر کبھی بحرانی کیفیت کا سامنا ہو تو صاحبِ ثروت لوگوں کو سنتِ عثمانی پر عمل کرتے ہوئے غریبوں کا سہارا بن کر اجر کمانا چاہیے، اس سے ضرورتمندوں کے حالات بھی بدلیں گے، دعائیں بھی ملیں گی اور اللہ تعالیٰ آپ کو بھی کئی گناہ بڑھا کر لوٹا دیں گے۔

اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ کے عہدِ سعید میں بھی قلتِ خوراک کا سامنا ہوا تو حضرت فاروق اعظمؓ مختلف اقدامات کے ساتھ ساتھ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتے ہوئے دعا کرتے: ''الٰہی! اپنے محبوب پیغمبر ﷺ کی امت کو ہلاکت سے بچا۔'' اور خود اپنی حالت یہ تھی کہ اچھا کھانا پینا ترک کر رکھا تھا اور فرماتے تھے کہ میری رعایا کو جو آسائشیں میسر نہیں ہیں، میں بھی استعمال نہیں کروں گا۔

جن حکمرانوں کے دلوں میں رعایا کی ہمدردی اور خیرخواہی ہوتی ہے وہ ایسے ہی اقدامات کیا کرتے ہیں۔ اپنے تعیّشات ترک کرکے سادگی اپنا کر دوسروں کے لیے نمونہ بن جایا کرتے ہیں۔

حکمران سے مراد صرف صدر یا وزیراعظم ہی نہیں، بلکہ حدیث پاک کی روشنی میں ''تم میں سے ہر کوئی حکمران ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا'' کے تحت ہم میں سے ہر کوئی بچوں کے باپ اور بیوی کے شوہر کی حیثیت سے گھر کی سلطنت کا حکمران ہے، لہٰذا گھروں کے سربراہوں کو بھی چاہیے کہ اس مہنگائی اور بحرانی کیفیت میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں اور مناجات کریں۔

یہاں اس تلخ حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ مہنگائی بڑھانے کے ذمہ دار ہم خود بھی ہیں۔ ہمارا طرزِ بودوباش غیرفطری بنتا جارہا ہے۔ ہم ''ھل من مزید'' کی دوڑ میں اخلاقی وانسانی اقدار کھورہے ہیں۔ اپنے سے فروتر کی طرف نہیں، بلکہ کم تر کی طرف دیکھنے کے ارشادِ نبوی سے رُخ پھیرے ہوئے ہیں۔ دوسری کی آسائشیں دیکھ کر ہم ہر قیمت پر اسی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ دوسرے کی آسائشیں دیکھ کر ہم ہر قیمت پر اسی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ کھانے۔ پینے اور پہننے کی چیزیں ہوں یا استعمال کی، ہم دوسروں سے بڑھنے اور نت نئے کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

جہاں ایک لباس سے کام چل جایا کرتا تھا، وہاں کئی کئی سوٹ ہم نے لازم ٹھہرا لیے ہیں۔ دیکھا دیکھ مہندی، بارات اور ولیمے کے الگ رنگوں کے لباس، جوتے اور دیگر لوازمات کے ساتھ ساتھ کھانوں کی کئی کئی ڈشیں بھی یقیناً باعثِ مہنگائی ہیں اور اس پر مستزاد ہوٹلنگ کا بڑھتا ہوا رجحان اور شادی ہالوں میں کھانوں کا ضیاع دردمندوں کو رُلا رہا ہے۔

بے برکتی اور بے سکونی کا ایک بڑا سبب زکاۃ نہ ادا کرنا بھی ہے۔ ہمارا اکثر سرمایہ دار طبقہ مالی خسارہ برداشت کر لیتا ہے، مگر زکاۃ کی برکت سے حاصل ہونے والی پاکیزگی اور بڑھوتری سے محروم ہے۔ اسی طرح ہمارے کسان پیداوار کی کمی اور بارشوں سے ہونے والی فصلوں کی تباہی تو گوارہ کر لیتے ہیں، مگر عشر ادا نہیں کرتے۔ یقیناً ناشکری اور ناقدری کے یہی رویے نعمتوں کے زوال اور بحرانوں کا باعث بن رہے ہیں۔ دراصل یہ سب اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور غصے کی علامتیں ہیں، ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ چھوٹے چھوٹے عذابوں میں مبتلا کر کے تنبیہ فرماتے ہیں کہ میرے بندو! پلٹ آؤ میری طرف قبل اس کے کہ تم پر بڑا عذاب مسلط کر دیا جائے۔

ہمارا ایک مزاج یہ بھی ہے کہ جب پتا چلتا ہے کہ فلاں چیز کی کمی واقع ہورہی ہے تو ہم زیادہ خریداری بھی اسی کی کرتے ہیں، جس سے اس کی قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب کہ کمیاب اور مہنگی چیز کا چند دن کے لیے استعمال اگر کم کر دیا جائے تو وہ خود بہ خود سستی ہوجائے گی۔

بہرحال قلتِ اموال، مہنگائی اور بحرانی کیفیتوں میں صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''میں صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں۔'' اس کے ساتھ ساتھ میسر

نعمتوں پر شکر بجالانا چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم شکر کروگے تو میں تمہیں مزید نوازوں گا۔ ہر لمحہ استغفار کرنا چاہیے، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مہنگائی سے بھی نجات عطا فرمائے گا، بحران بھی ٹل جائیں گے اور قلت اموال کی پریشانی بھی ختم ہوجائے گی۔

آیئے مل کر ہاتھ اٹھائیں، الٰہی! ہمارے حکمرانوں کو ہمارا دکھ درد سمجھنے کی توفیق اور عوام کی ہمدردی نصیب فرما۔ الٰہی! اپنی کمی کوتاہی اور گناہوں کے باعث بننے والے گناہ معاف فرما۔ پاک پروردگار! اس عذابِ مہنگائی سے ہمیں نجات عطا فرما اور ہمارے گھروں میں خیر وبرکت نازل فرما۔ آمین۔

دو نومسلم بہنوں کی
ایمان افروز کہانی

پانچویں ملاقات، شاہی ملاقات

یہ بدھ ۱۸ مارچ ۲۰۰۹ء کا قصہ ہے۔ میرے ابو نے شاہی ملاقات کا انتظام کیا اور مفتی نعیم صاحب نے بڑا پرتپاک استقبال کیا کہ اس دفعہ شاہی فرمان کے ساتھ ابو آئے تھے۔

میرے والد صاحب کے ساتھ آنے والوں میں درجِ ذیل لوگ شامل تھے۔

۱۔ ایک بااثر صوبائی وزیر صاحب۔

۲۔ سابق ایم پی اے ڈاکٹر رمیش۔

۳۔ راجہ آسن دس سابق ایم این اے۔

۴۔ ''منگلا شرما گاندھی'' (خاتون) اقلیتوں کی سٹی کونسلر اور سماجی کارکن جن کا تعلق کسی این جی او سے بھی تھا۔

۵۔ چند ہندو مسلم حضرات بھی تھے جو اپنی اپنی ذات میں کچھ معزز حیثیت رکھتے تھے۔

۶۔ بڑی بہنیں، دو بہنوئی، ایک بڑا بھائی اور ایک چھوٹا بھائی تھا۔

۷۔ کچھ میڈیا کے لوگ بھی شامل تھے۔

ہم مکمل پردے میں ان کے سامنے آئے بعض دفعہ مجبوراً کچھ ناپسندیدہ حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہم اس قسم کے حالات سے اب بیزار ہوگئے تھے، لیکن مجبوری تھی کیا کر سکتے تھے۔ گھر والوں کی مہربانیاں تھیں ..... سب سے پہلے مفتی صاحب نے بڑی شفقت کے ساتھ ہمارا تعارف ان حضرات سے کرایا اور فرمایا کہ:

مفتی صاحب: بیٹا یہ حضرات آپ سے چند سوالات کریں گے آپ بغیر خوف وخطر اپنے

فیصلوں سے ان کو مطمئن کریں، آپ پر کسی بھی قسم کا دباؤ نہیں، نہ مدرسہ کا اور نہ والدین کا، کیونکہ آپ اپنے فیصلوں میں خودمختار ہیں۔

عائشہ: سب سے پہلے میں اپنے والدین اور معزز مہمانان کو خوش آمدید کہتی ہوں، مجھے خوشی ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح آپ حضرات نے ہمیں یاد رکھا ہوا ہے۔ انشاء اللہ ہم آپ کو ایک بار پھر پوری طرح مطمئن کریں گے۔

ایم پی اے ڈاکٹر رمیش: آپ کا نام مونیکا اور نیلم ہے؟

عائشہ: جی کبھی تھا۔ لیکن اب ہم مسلم ہیں۔ میرا نام عائشہ اور میری چھوٹی بہن کا نام مریم ہے۔

ڈاکٹر رمیش: آپ یہاں کیسے، اپنا گھر چھوڑ کر؟

عائشہ: ہم ۳ سال سے اپنے والدین کے گھر میں مسلمان ہوگئیں تھیں۔ جب ہمارے والدین کسی ہندو سے شادی کرانے لگے تو ہمارے لئے یہ حرام ہے، لہٰذا مجبوراً گھر چھوڑنا پڑا۔ ہمیں اپنی مذہبی عبادات، تعلیم اور عمل کرنے کی آزادی بھی نہ تھی، بلکہ تشدد کیا جاتا تھا، ان حالات میں ہمارا گھر چھوڑ کر یہاں آنا ہی بہتر تھا۔

شریمتی شرما گاندھی: تم گھر چلو ضمانت میں دیتی ہوں کہ تمہیں دین کی آزادی ہوگی۔

عائشہ: اب جبکہ آپ دین کی آزادی کا ذمہ لیتی ہیں تو ہمیں آپ اسی مدرسہ میں ہی رہنے دیں، ہم یہاں بہت خوش ہیں، اگر کسی میڈیکل کالج میں پڑھتے تو پھر بھی ہاسٹل میں رہتے ناں؟ اس لئے دین کی تعلیم کیلئے دین کے ہاسٹل میں ہی رہنے میں کیا حرج ہے۔ اچھا ہے یکسوئی سے تعلیم حاصل کرکے باعمل ہوکر نکلیں گے۔ شرما صاحبہ تو خاموش ہوگئیں۔

صوبائی وزیر صاحب: بیٹا اگر والدین کے گھر نہیں جانا چاہتیں تو کراچی میں اور بھی ادارے ہیں آپ وہاں رہ سکتی ہیں؟

عائشہ: وہ کون سے ادارے ہیں، کیا میں نام معلوم کرسکتی ہوں؟

وزیر صاحب: جی ہاں: ایدھی ہوم یا دار الامان، وغیرہ ہیں۔

عائشہ: اگر یہ سب دینی تعلیم کے ادارے ہیں جہاں ہم دین کی تعلیم مکمل کر لیں گے تو مدرسہ کی تمام طالبات کو لے چلتے ہیں۔ بلکہ لڑکوں سے بھی درخواست ہے کہ وہ بھی وہیں چلیں۔

شرما گاندھی: زیادہ بک بک نہ کرو، میں نے تم سے زیادہ پڑھ رکھا ہے، میں نے دو دفعہ PHD کر رکھی ہے۔

عائشہ: میری آپ سے درخواست ہے کہ ان تینوں اداروں کو دینی ادارے ثابت کریں۔

عائشہ: جناب وزیر صاحب! اب میں آپ کی ایک مسلمان بیٹی ہوں۔ اب اس نظر سے بھی مجھے دیکھئے۔ کیا کوئی مسلمان اپنی بیٹی کو کسی ہندو سے بیاہے گا؟ آپ بھی سمجھتے ہیں ناں کہ یہ حرام ہے۔ خدارا ہم اب آپکی بیٹیاں ہیں۔ ہمارا تحفظ اب آپ کا بھی فرض ہے۔

وزیر صاحب: بالکل بیٹی۔ مجھے آپ کے خیالات سن کر بہت خوشی ہوئی۔ میرے علم میں یہ لایا گیا تھا کہ آپ کو یہاں زبردستی لایا گیا ہے، اسلئے میں معذرت خواہ ہوں۔

شرما گاندھی: تم ایک بار اپنے والدین سے تنہائی میں بات کرو۔

عائشہ: لیکن ہماری ناظمہ ہمارے ساتھ رہے گی، اب ہم بھی خوف محسوس کررہے ہیں۔ ہم نے اکیلے جانے سے انکار کردیا۔

عائشہ: معزز حضرات میں ایک بار پھر آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے اور میری بہن نے اپنی رضا اور خوشی سے اسلام قبول کیا ہے، اپنی مرضی سے مدرسہ آئے ہیں۔ ہم عاقل وبالغ ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارے والدین جلد سے جلد دین کے دائرہ میں داخل ہوجائیں۔ محترمہ شرما گاندھی اور دیگر غیر مسلم حضرات کو دین کی دعوت دے رہی ہوں کہ یہ دنیا فانی ہے، آخرت کے خسارہ سے بچنے کیلئے اس دنیا میں ہی قربانی دیں لیں اور اسلام قبول کرکے مسلمان ہوجائیں۔ معزز مسلمان مہمان حضرات سے گزارش ہے کہ ہمارے لئے اور اپنے لئے صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت اللہ سے مانگیں، میں آپ سب حضرات سے معذرت خواہ ہوں اور مودبانہ گزارش کروں گی کہ اب اس کے بعد آپ اپنا قیمتی وقت اس سلسلہ میں آکر ضائع نہ کریں۔

شرما گاندھی: نہیں آپ کو ایک دفعہ بہنوں سے تنہائی میں ملنا پڑے گا یہ برقعہ اتار کر۔

عائشہ: ٹھیک ہے آپ بنات کے مدرسہ میں چلیں، وہاں ملاقات بھی ہوجائے گی اور انکی تسلی بھی ہوجائے گی، ہماری رہائش بھی دیکھ لیں گی۔

ہم شرما گاندھی اور دونوں بہنوں کو لے کر بنات کے مدرسہ میں آگئے۔ وہاں ہم نے اپنا کمرہ دکھایا جو ایئرکنڈیشن تھا۔ مدرسہ کا انتظام دیکھ کر ان کو حیرت تو ہورہی تھی، لیکن اظہار نہیں کر سکتی تھیں۔ ساری طالبات نے ان کا استقبال کیا، سلام کرتی رہیں، چائے وغیرہ سے ان کا اکرام کیا گیا۔ بہرحال وہ مطمئن تو ہوگئیں سیکورٹی اور سہولت کے لحاظ سے، لیکن وہی رٹ کے ہمارے

ساتھ چلو۔ بنات کے مدرسہ کے دروازے پر اپنے ابو اور بھائیوں سے بھی بغیر برقعے کے ملے۔

ابو: ہاں .....۔ اب میری بیٹیاں لگ رہی ہو شاباش اب گھر چلو۔

عائشہ: ابو.....سوائے (گھر چلو) اس ایک جملے کے ہمارے کسی اور دکھ سکھ کا بھی احساس ہے؟ یہ خون کی کشش ہے آپ ہمیں معاف کردیں۔ ہمیں اپنے رب کی محبت زیادہ سچی لگتی ہے۔ جس نے آپ کے بغیر بھی بہت خوش رکھا ہوا ہے، ہمیں کسی چیز کی کمی کی یاد تک نہیں۔ آپ کے پاس تو شمع محفل ہونے کو معتبر سمجھا جاتا تھا لیکن خدا کی قسم یہاں ہماری کسی نے انگلی تک نہیں دیکھی۔ ہماری آواز بھی آج آپ کی وجہ سے مردوں نے سنی ہے۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو.....مردوں نے اسے بازار دیا

شرما گاندھی صاحبہ کی وہی ہرزہ سرائیاں .....

شرما گاندھی: سن لو مونیکا اب ہائی کورٹ میں اپریل کو پیشی ہے اور آپ نے آ کر ہمارے حق میں بیان دینا ہے، ورنہ ذلت تمہارا مقدر ہوگا۔

عائشہ: مجھے ذلت سے دوچار کرنے کی قدرت رکھتی ہیں آپ؟ کیا یہ بھول گئیں کہ انسان کو ذلت وعزت دینے والی ذات نے ہی آپ کو بے بس پیدا کیا ہے۔

شرما صاحبہ، بک بک جھک جھک کرتی سب کے ساتھ رخصت ہوگئیں۔

عزت واکرام کا انداز

۱۹مارچ ۲۰۰۹ بروز پیر ۱۲:۳۰ بجے حفظ کی چھٹی ہوئی تھی اور ہم کھانا کھا کر آرام کرنے کیلئے ابھی کمرے میں پہنچے ہی تھے کہ ایک بچی دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔

بچی: عائشہ باجی! آپ کو ناظمہ بلا رہی ہیں۔ جلدی جائیں شاید آپ کا فون آیا ہے۔

اللہ خیر! نہ جانے کس کا فون ہے۔ ایک تو یہ فون بڑا دل دھڑکاتے ہیں۔ میں بھاگی بھاگی نیچے ناظمہ کے آفس پہنچی۔

ناظمہ: ہاں بیٹے آپ کا فون آیا تھا، مفتی صاحب کا تھا، اب پھر آنے والا ہے تم انتظار کرو یہیں پر۔

جل تو جلال تو کا ورد۔ یا اللہ یہ مفتی صاحب کے پاس میری کیا خبر آئی ہے؟ کوئی شکایت تو نہیں پہنچی؟ اے مالک میری عزت تیرے ہاتھ۔ الٰہی مفتی صاحب کے سامنے میری عزت رکھنا۔ یا اللہ مجھے معاف کردے اور میں ہاتھ جوڑے اللہ تعالیٰ سے مفتی صاحب کے آگے اپنی عزت مانگ رہی ہوں کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ایک دم سے میں اپنے خیالوں سے اچھلی۔

ناظمہ: عائشہ! کیا ہوا تمہیں؟ کیوں رو رہی ہو؟ یہ لو فون ہے تمہارا۔

عائشہ: اس ..... اس ..... السلام علیکم!

مفتی صاحب: وعلیکم السلام! عائشہ بیٹی؟

عائشہ: جی جی!

مفتی صاحب: بیٹا مبارک ہو بہت بہت، تمہاری کل کی بات چیت نے دل خوش کردیا جیتی رہو بیٹی، جیتی رہو۔ میں تو کیا پورے مدرسہ کے اساتذہ آپ کو مبارکباد دے رہے ہیں۔ کل ان سب کی طبیعت صاف کردی آپ نے۔ بیٹا اب تک پورے مدرسہ کی بچیوں میں سے کوئی بھی اتنی استقامت سے نہیں بول پائی ہے، اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے آپ پر۔ میں نے آپکو مبارکباد دینے کیلئے فون کیا ہے۔ مجھے فخر ہے آپ پر۔ اللہ تعالیٰ کے آگے مجھے بھی سرخرو کر دیا۔ اللہ ایسی نیک بچیاں سب کو دے آمین۔ اچھا بیٹا خدا حافظ۔ اللہ آپ کو ہمیشہ سایہ عافیت میں رکھے۔ آمین

اور عائشہ کی روح جاتے جاتے لوٹ آئی۔ عائشہ سر اونچا کیئے اپنے رب کی شکر گزار ہوئی۔ تخصص کی ایک دوست قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی کہنے لگی:

رقیہ باجی: اگر صرف اوپر دیکھنے پر ہی تمہیں خدا مل رہا ہے تو تکتی رہو۔ اگر دل میں بھی خدا کو موجود پا رہی ہو تو چلو سجدہ شکر ادا کرو۔

عائشہ: اللہ ایک تو تمہاری یہ دانائی کی منطقیں بڑی راہ دکھاتی ہیں۔

میرے مالک! تیرے اکرام کا یہ انداز بھی بھایا (دھوئے گئے ایسے کہ سب پاک ہوگئے) ایک بزرگ مفتی صاحب کی زبان مبارک سے میری استقامت کی خوشخبری! ''کہاں میں اور کہاں یہ مقام'' اللہ اللہ کہاں مفتی صاحب اور کہاں میری ذات؟ اللہ اللہ! کہاں وہ مدرسہ میں آنے کا پہلا دن اور کہاں آج؟ اللہ اللہ!

یہ تیرے کرم کے انداز میں ..... یہ میرے وطیرہ کی بات نہیں

(مصنفہ)

میرے پروردگار! یہ جھولیاں بھر بھر کر عزت واکرام دینے والی بیشک تیری ہی ذات ہوسکتی

ہے اور بس.....

جس کا رب! اس کا سب

تو نے سچ ہی کہا ہے کہ خلوص دل سے مجھے یاد کرنے والے کو میں فرشتوں کے ذریعے نیک لوگوں سے یاد کراتا ہوں۔ میرے مولا تیرا وعدہ پورا ہوا۔ عائشہ ہی کم عقل تھی کہ دوسیکنڈ گنوادیئے اس نے۔

خلوص دل کے سجدے رائیگاں جایا نہیں کرتے
غم سے گھبرایا نہیں کرتے

عدالت جانے کی تیاری

۹ اپریل ۲۰۰۹ء، آج عدالت میں ہماری آخری پیشی ہے۔ دوپہر ۱۲ بجے ہمیں وہاں پہنچنا ہے۔ صبح سے دل بیقرار ہے، ہاتھ پاؤں میں جان نہیں ہے، انجانا خوف اور ممکنہ جدائی سے لرزہ لرزہ ہیں، ایسا معلوم ہورہا ہے کہ جیسے اب ہم والدین بھائی، بہنوں سے جدا ہونے جارہے ہیں۔ بہت ہی دل پریشان، سارے مدرسہ کی طالبات اورادووظائف میں مشغول۔ ہم پر بھی پڑھ پڑھ کر دم کر رہی ہیں۔ پانی پلا رہی ہیں، ایسی محبت کے تو ہم تر سے ہوئے تھے، پھر بھی ایک انجانی جدائی کا احساس! معلوم ہوتا کہ کوئی دل کو مسل رہا ہے۔ ذہن میں بار بار یہ خیال کہ اب اگر کمزور پڑ گئے تو.....؟

عزیزوں کی جدائی ..... یا ..... اپنے رب کی جدائی ..... فیصلہ آج ہونا ہے۔ مریم تو ویسے ہی کمزور دل۔ مدرسہ میں کافی مرتبہ بہن بھائیوں کو یاد کرکے روتی رہتی تھی۔ میں خود بھی ان کو یاد کرکے روتی تھی، لیکن مریم سے چھپ کر، پردوں کے پیچھے ..... مریم کو ڈھاریں بندھاتی رہتی کہ بہن جدائی کے یہ دن برداشت کرلو انشاء اللہ ہم ایک دن اپنوں میں ہونگے۔ تم اللہ کی ذات سے مایوس نہ ہوا کرو، وہ ہمارے حال زار سے بے خبر نہیں۔ دیکھنا ہمارا پورا خاندان مسلمان ہوکر ہمارے ساتھ رہے گا۔ یہ کام انشاء اللہ تعالیٰ ہماری زندگی ہی میں اللہ رب العزت فرمائیں گے۔ اگر زندگی میں نہ ہوسکا تو جو چراغ ہم نے جلائے ہیں ان کی روشنی ہمارے گھر سے ہوتی ہوئی دور دور تک جائے گی اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ ہم آج عدالت میں جدا ہونے تو جارہے ہیں لیکن یہ جدائی ہمیشہ کیلئے ملن ثابت ہوگی، مجھے پورا یقین ہے۔ انشاء اللہ۔

مایوس نہ ہو رحمتِ پروردگار سے ..... وہ بے خبر نہیں ہے تیرے حال زار سے

مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ عنقریب میرے مولا کی طرف سے کوئی خوشخبری آنے والی ہے۔ کیا ہوگی؟ کیسی ہوگی؟ یہ تو وسعت والا ہی جانتا ہے۔ میں بے وسعت ہوں۔ مولا اور بندہ اپنی اپنی وسعت کے مطابق دیتا اور مانگتا ہے۔ مریم کو ڈھارس دے کر میں نے قرآن شریف پڑھا۔ سورۃ قریش پر نظر ڈالی، اس کو پڑھا اپنے اوپر دم کیا، مریم پر دم کیا، ٹھیک ۱۱:۳۰ پر ہم ناظمہ صاحبہ اور ناظم صاحب کے ہمراہ مدرسے سے عدالت کیلئے روانہ ہوگئے۔ پولیس کی ۴ موبائلیں، آگے پیچھے ہماری حفاظت کرتی ہوئی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ تسبیح میرے ہاتھ، میں اللہ کا ذکر، محمد مدنی ﷺ پر درود وسلام بھیجتی جارہی تھی، مریم بھی قرآنی آیات کا ورد کررہی تھی، ناظمہ بھی ناظم صاحب بھی تسبیح پڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک لال سگنل پر گاڑی رکی تو قریبی ہوٹل سے قوالی کی آواز آئی .....

در پہ بلا لو مکی مدنی ﷺ ..... پاس بلا لو مکی مدنی ﷺ

قوالی کے ان اشعار نے میرے جسم میں بجلی بھردی۔ باقاعدہ معلوم ہوتا تھا کہ برقی رو میرے جسم میں دوڑ رہی ہے اور کوئی مجھے بلا رہا ہے۔ اردگرد نظر دوڑائی کوئی نہ تھا سوائے ٹریفک کے۔

عائشہ: مریم کچھ محسوس ہوا؟

مریم: نبی کریم ﷺ کا بلاوا آیا ہے سن نہیں رہیں کیا؟

در پہ بلا لو مکی مدنی ﷺ ..... پاس بلا لو مکی مدنی ﷺ

عائشہ یہ مقدمے سے جان چھوٹے تو عمرہ کرنے جائینگے ..... ہر فکر سے آزاد معصوم خواہش، اللہ پوری کرے۔ آمین۔

عائشہ: سمجھی؟ اللہ ہمیں اپنی طرف بلائیں اور ہم .....کفر کی طرف جائیں ..... ناممکن .....

آپکا ذکر ہے دو جہاں میں .....شرط توحید کامل یہی ہے

عدالت عالیہ میں

۱۲ بجے دوپہر عدالت پہنچ گئے۔ ہمارے نام کی پکار ہوئی اور ہم اندر گئے۔ عدالت میں

ہمارے والدین، بھائی، بہنیں، چھوٹا بھائی، بہنوئی، سب ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے، ان کے ساتھ انکی وکیل محترمہ نورنا آغا بھی تھیں، جبکہ ہمارے ساتھ ہمارے وکیل بیرسٹر منصورالعارفین صاحب (جو بہت ہی شریف النفس اور بزرگ وکیل ہیں۔بعض وکلاء کی عدالت میں اپنی ایک حیثیت ہوتی ہے عدالت عالیہ میں انکی بھی اپنی ایک نمایاں حیثیت ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، انہوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا اور یہ سب اللہ کے اکرام کے نظارے تھے جن کو ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ورنہ کہاں ہم اور کہاں یہ مہنگے ترین وکلاء حضرات) تھے۔

معزز جسٹس جناب گلزار احمد اور جناب ملک ایم عاقل کی اجازت سے، والدین کی طرف کی خاتون وکیل مخاطب ہوئیں۔ انہوں نے یہی کہا کہ بچیوں کو اغواء کیا گیا ہے۔ ملاقات نہیں کروائی جاتی، اس قسم کے ماحول میں لڑکیاں ڈر گئیں ہیں۔ لہٰذا ان کو ایدھی ہوم یا دارالامان بھیجا جائے۔ تاکہ والدین ان سے ملاقات کر سکیں۔ اس قسم کی ساری باتیں میرے لئے ناقابل برداشت تھیں، میں فورا اٹھ کھڑی ہوئی اور کہا کہ:

عائشہ: معزز جج صاحب! یہ ساری باتیں ہمارے بارے میں ہورہی ہیں، اسلئے ہماری زندگی کے بارے میں ہم سے بھی پوچھا جائے۔

جج صاحب فرمانے لگے: جب آپ سے پوچھنے کا سوال ہوگا، وہ پوچھا جائے گا، فی الحال ان دونوں وکیلوں سے بات ہوگی۔ جج صاحب نے والد سے پوچھا کہ آپ کی بچیوں سے ملاقات ہوئی ہے کہ نہیں؟

والد صاحب: پانچ مرتبہ ملاقات ہوئی ہے، لیکن مکمل تنہائی میں نہیں ہو پارہی ہے۔

جج صاحب نے والد صاحب اور ہمیں الگ کمرے میں ملاقات کیلئے بھیج دیا۔ ابو کا غمزدہ اترا ہوا چہرہ میں برداشت نہ کر سکی اور اپنے رخ پر نقاب گرائے رکھا، کہیں زارو قطار رونا ابو دیکھ نہ لیں۔ اف! یہ کیسا منظر تھا۔ خدا کسی کو اس امتحان میں نہ ڈالے۔ واقعی سخت قربانی ہے اس کا ادراک آج ہوا۔ باہر بھائی بہن رو رہے تھے۔ بہنوئی سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ چھوٹا بھائی دیوار کی طرف منہ کئے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ مریم نے اس کو بلایا تو اور دور ہوگیا۔ مریم منہ چھپائے ہچکیاں لے رہی تھی۔ اندر کمرے میں آ کر ابو نے کہا:

ابو: مونیکا! اب اگر تم نے انکار کیا تو میں اپنے آپ کو شوٹ کرلوں گا، اور دل پر ہاتھ رکھ کر نڈھال ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے، میں ابو کے پیروں میں بیٹھ گئی اور پیر پکڑ لئے۔ ابو کی ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ ابو ..... ابو ..... ابو مجھے معاف کردیں۔ قیامت کے دن انشاء اللہ ایسے ہی چمٹی رہوں گی۔ میرے ابو جی ..... ابو جی ..... معاف کر دیں۔ دیکھیں عائشہ ہاتھ جوڑتی ہے، میں پوری کی پوری اپنے ابو سے لپٹ گئی، ان کا سینہ چومنے لگی۔ ابو نڈھال بے بس۔ ابو کے پسینہ پسینہ سینے کی خوشبو، اپنی سانسوں میں بھرنے لگی۔ ابو ..... ابو ..... ایک دفعہ ''عائشہ'' کہو انشاء اللہ عائشہ کو ہمیشہ اپنے پیروں میں پاؤ گے۔ آپ کی نافرمان بیٹی کو اپنے خالق کی فرمانبرداری مل گئی ہے، میں کیا کروں؟ کیسے آپ کو مناؤں؟ ابو جی عائشہ کا یہ بولتا ہوا وجود جب خاک بستر ہوگا تو ..... تو پھر عائشہ کہاں سے لاؤ گے؟ لیکن عائشہ اگر اپنے رب کی فرمانبرداری میں مری، تو قیامت کے دن اپنی اس قربانی کی قیمت تو فخر سے وصول کریگی ناں! ابو جی مسلمان ہوجائیں، ایسی جگہ آپ کو لیجاؤں گی کہ دنیا والے کچھ نہ کرسکیں گے۔ میری آہ وزاری کو ابو خاموشی سے سنتے رہے، کچھ دیر میری طرف حسرت سے دیکھتے رہے، اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے رہے۔ انکو الفاظ نہیں مل رہے تھے یا وہ بول نہیں پارہے تھے۔ پیدائش سے لیکر اب تک کی مونیکا کو بڑی حسرت سے دیکھتے رہے، آخر میں ہنکارا بھر کر اپنا گلوگیر گلا صاف کیا اور آہستہ سے مخاطب ہوئے۔

والد صاحب: مونیکا! بڑا ناز تھا تم پر! تم نے یہ مجھے کیسا روگ دے دیا۔ پوری زندگی اب تم مجھے نہ دیکھ پاؤ گی۔ میں تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔ کیا چھوڑا ہے تم نے میرے لئے اس دنیا میں۔ کس نے دیکھی ہے وہ دنیا تم نے بھی اسی دنیا میں فیصلہ کیا ہے اور میں بھی اسی دنیا میں تم سے اپنے لئے فیصلہ چاہتا ہوں۔ اسی دنیا میں آگے جا کر تمہارے ساتھ کیا ہوگا وہ بھی تم اسی دنیا میں دیکھو گی۔ دوسری دنیا میں نہیں دیکھو گی۔ یہ ملا لوگ تین تین چار چار شادیاں کرتے ہیں تم بھی انہی کے ہتھے چڑھو گی یہ تمہیں کہاں کھپائیں گے؟ کیا کریں گے تمہارا؟ تمہارے پیچھے کون سامیکہ کا زور ہے جو کوئی ڈرے گا؟ میری بیٹی تم کہاں پیدا ہوئی، اور کہاں پہنچ گئی ہو، اور اب تم کہاں جاؤ گی؟ نہ سوچا نہ سمجھا اتنا بڑا قدم اٹھالیا؟ اپنے باپ کا مان توڑ دیا؟ کچھ تو اعتبار کیا ہوتا، اور تو اور چھوٹی بہن کو بھی اپنا بنالیا، وہ بھی تمہاری زبان بولتی ہے۔ کچھ سوچا ہے کہ اسکا سہارا کون بنے گا؟ کیا تم ساری عمریوں ہی دربدر صحرا ہوگی؟ یہ مدرسہ کی لڑکیاں پڑھ کر چلی جائیں گی۔ پھر کون ہوگا تمہارا پرساں حال؟ کیا مستقبل ہوگا تمہارا؟ کیا ساری عمر اِن ملاؤں کے سہارے گزاروں گی، جو پہلے سے ہی شادی شدہ ہوتے ہیں؟

میں تھوڑی دیر سن سی ہوگئی۔ ہلکے ہلکے چکروں نے سر کو بوجھل کر دیا۔ بند ہوتی آنکھوں

میں روشنی کی لہروں نے پھیل کر دماغ تک رسائی لی اور ایک فلم دماغ کے پردوں پر چلا دی، ''واقعہ کربلا''، دین وایمان پر قربان ہونے والے! یہ شہید ..... شہید ہونے والے! کیا وہ لعل وگوہر بھول گئیں، وہ کس کے بیٹے تھے؟ کس کے نواسے تھے؟ کیا ان کی جوانی نہ تھی؟ کون سی راہ پر چلے تھے وہ؟ کیا وہ راہ غلط تھی؟ کیا وہ امر نہ ہوئے؟ کیا ان کو کسی نے نہیں روکا تھا؟ کیا وہ مان گئے تھے؟ کیا انہوں نے کفر کا کہنا مان لیا تھا؟ نہیں! انہوں نے ایمان ودین کی خاطر حق کی راہ اختیار کی تھی اور شہادت پائی، تو پھر میں کیا چیز ہوں، انکے پیروں کی خاک! اس خاک کو ناپاک نہیں ہونا چاہئے۔ کہاں بیٹھی ہوں بھول گئی، صرف اور صرف ابو کے سوال یاد رہے۔

عائشہ: بابا جانی! مجھے معاف کردیں۔ عائشہ کا وجود خاکی ہے فنا ہے۔ ابھی اور اسی وقت اگر عائشہ تڑپ کر جان سے جائے تو ممکن ہے، یہ آپ بھی سمجھتے ہیں کہ موت کا کوئی وقت نہیں، تو کیا آپ مجھے دیکھ پائیں گے زندگی بھر؟ اس دنیا کے فیصلے ابد سے جڑے ہیں یہ آپ بھی سمجھتے ہیں ورنہ تو دوسرا جنم کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ میری پرورش تو ماں اور باپ نے کی تھی۔ آپ کی پرورش تو بن ماں باپ کے ہوئی اس وقت آپ کو گمان تھا کہ آپ اس مرتبہ پر ہونگے؟ آپ کو کس نے سنبھالا؟ آئندہ آپ کے ساتھ کیا ہوگا معلوم ہے آپ کو؟ اس دنیا میں انسان اپنے ایمان اور نیت پر صلہ پاتا ہے۔ ایک چور وہ صلہ نہیں پا سکتا جو ایک ایماندار صلہ پائے گا دنیا میں۔ میں نے اسلام ملا لوگوں کے لئے قبول نہیں کیا، اپنے اللہ اور اس کے حبیب ﷺ کی خوشنودی کیلئے دین کی رسی پکڑی ہے، وہ رب جب آپ کو ڈھیل دیکر اس دنیا میں عزت دے رہا ہے، تو میں جو اس کی چاہت میں کیا کیا نہ چھوڑ چکی، کیا وہ مجھے چھوڑ دے گا؟ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ مرنے کے بعد والدین تک چھوڑ دیتے ہیں، لیکن وہ ..... وہ تو مہمان بنا کے رکھتا ہے اپنے سے قریب تر۔ آپ مرنے کے بعد مجھے اپنے قریب رکھیں گے؟ آپ خود بتائیں پھر کون ہے جو ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ روحوں کو تو آپ بھی مانتے ہو ناں! انکا محافظ کون ہوگا آپ کو معلوم ہے؟ ابو مجھے تھوڑی دیر تک تکتے رہے اور پھر اٹھ کر باہر آگئے۔ میں بھی آگئی، جج صاحب نے والد صاحب سے پوچھا کہ اب آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ (میں نے جلدی سے سورۃ قریش پڑھ کر ابو پر پھونک دی)، میں مسلسل یہ سورۃ پڑھتی رہی کبھی مریم پر کبھی والد صاحب پر پھونکتی رہی، کیونکہ مریم بھی کمزور طبیعت کی ہے مجھے اس سے ڈر لگ رہا تھا۔

والد صاحب گویا ہوئے: جج صاحب میں نے پورا زور لگالیا، لیکن میری بیٹیاں میری قسمت میں نہیں ہیں لہٰذا جو یہ چاہتی ہیں ہم مجبور ہیں۔

اب جج صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ کمرہ عدالت میں جج صاحب نے مجھ سے شناختی کارڈ اور دوسرے کاغذات مانگے۔ اف! وہ سب تو مدرسے میں ہی رہ گئے یاد ہی نہ رہے کہ لیکر جانے ہیں۔ جج صاحب غصہ سے بولے:

جج صاحب: پیشی پر آئی ہیں اور کاغذات نہیں لائیں؟

جج صاحب نے قلم کو ٹیبل پر پٹخ دیا۔ اب تو میں رونا دھونا سب بھول گئی اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا ''سورۃ قریش'' پڑھ کر جج صاحب پر پھونک دی، اتنے میں ناظم صاحب باہر گئے اور کاغذات لیکر اندر آگئے، مدرسہ والوں نے پہلے ہی بھیج دیئے تھے شکر الحمدللہ۔ پھر انہوں نے مجھ سے چند سوالات کیئے جن کے جواب میں نے نہایت اطمینان سے دیئے۔ میرے والدین کے بارے میں چند سوال کئے، پھر پوچھا کہ آپ کے اخراجات کون پورے کرتا ہے؟

عائشہ: ہمارے سارے اخراجات مدرسہ پورے کرتا ہے، ہم وہیں رہنا چاہتے ہیں، کیونکہ دینی تعلیم ہم وہیں رہ کر حاصل کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ ہمارے سارے حالات ہمارے وکیل کے ذریعہ جج صاحب کو معلوم ہو چکے تھے۔ جج صاحبان نے فیصلہ ہمارے حق میں دے کر ہمیں ہماری مرضی پر چھوڑ دیا۔

لہو دے کر چمن میں ہم کلیوں کو نکھارے آئے
قرض جسم وجان بھاری تھا لیکن اُتار آئے

ہمارے سارے گھر والے رو رہے تھے۔ ابو بھی رو رہے تھے۔ چھوٹا بھائی دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ میں بھاگ کر اسے پکڑنے گئی کہ چپ کراؤں، لیکن یہ کیا ..... وہ میرا ہاتھ چھڑا کر دور جا کر کھڑا ہوگیا۔ اف یہ اذیت ..... میں روتی ہوئی وہیں کھڑی رہ گئی۔ بہنیں، بھائی، سب عزیز، ابو سب چلے گئے عدالت سے۔ میں اور مریم انکو بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد ہمارا کیا حال ہوا کچھ نہ پوچھیں۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، کبھی بہنیں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہی تھیں، کبھی ناظمہ کے گلے لگ کر رو رہی تھیں۔ ہمارے وکیل بیرسٹر منصور صاحب بھی رو رہے تھے، بہت ہی بزرگ ہستی ہیں، ہمارے قریب آئے، ہمارے سروں پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ:

وکیل صاحب: (روتے ہوئے) بیٹا! اللہ نے آپ کو سرخرو کیا، قبول کیا، میری طرف سے

مبارکباد قبول کرو ۔ اللہ آپ جیسی ایمان والی بیٹیاں سب کو دے۔ اتنا پختہ ایمان واستقامت، بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔ میں برابر آپکا مشاہدہ کررہا تھا، آپ عدالت میں آ کر بھی اپنے رب کونہیں بھولیں، اور میں نے دیکھا کہ آپ نے ظہر کی نماز بھی ادا کی۔ میرے لئے اور میرے اہل خانہ کیلئے خاتمہ بالخیر کی دعا ضرور کیجئے گا۔ اور آنکھوں سے آئے آنسو، رومال سے پونچھتے ہوئے چلے گئے۔ پھر ہم نڈھال نڈھال تھکے تھکے سے باہر آئے، ناظمہ کی رہبری میں گاڑی تک آئے، بالکل خاموش گاڑی میں بیٹھے۔ سیکورٹی کے بزرگ آفیسر میرے قریب آئے، مبارکباد دینے لگے اور اپنے لئے دعاؤں کی درخواست کرنے لگے اور ہم بالکل خاموش، جیت کر بھی ہارے ہوئے لگ رہے تھے ہاں واقعی..... والدین کو ہرانا بہت بڑے دل گردے کی بات ہے۔

صدمہ بھی اٹھانا سر بھی کٹانا پڑتا ہے
جنت میں جانا آسان نہیں گھر ہار لٹانا پڑتا ہے

(سمیہ مجاہد)

مدرسہ میں آئے تو مفتی صاحب کی اہلیہ معہ ہماری مخیّرہ خاتون کے اور سب مدرسہ کی طالبات بہت بے چینی سے منتظر تھیں۔ گلے لگ لگ کر ان سے روتے رہے اور وہ تسلّی وپیار کے خزانے لٹاتی رہیں۔ کھانا لگوایا، سب نے ساتھ کھانا کھایا، کیونکہ ہمارے جانے کے بعد کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا، ہمارے آنے کا انتظار کرتی رہی تھیں اور پڑھتی رہی تھیں۔

ایک ہفتہ بعد

مدرسہ کی طالبات، معلمات اور اساتذہ حضرات بہت زیادہ خوش تھے، معلوم ہوتا تھا کہ آج ہماری عید ہے، مسجد کے مینار پہلے سے زیادہ روشن نظر آتے تھے (نیت کی نظر سے)۔ ہم تقریبا روزانہ ہی اپنی دوستوں سے اپنے عزیزوں کا تذکرہ کرتے تھے اور خیال یہی تھا کہ شاید اب وہ ہم سے کبھی رابطہ نہ رکھیں گے، لیکن شاید بندہ اپنی وسعت کے مطابق سوچتا ہے جبکہ قدرت لامحدود..... وسعت رکھتی ہے۔ ایک ہفتے کے بعد بڑی بہن نے فون کیا:

کملا: ہیلو مونیکا کیسی ہو؟ میں کملا ہوں۔

عائشہ: دیدی کیسی ہو، بچے ٹھیک ہیں؟

کملا: ہاں۔ .....سب تمہیں یاد کرتے ہیں۔ روتے ہوئے بتارہی تھیں۔ ابو بھی تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تم لوگ ٹھیک تو ہو ناں؟ لچھمی انڈیا جارہی ہے اپنے شوہر کے ساتھ۔

عائشہ: لچھمی سے کہو مجھ سے مل کر جائے۔

کملا: نہیں اب وہ نہیں آسکتی۔ اس کی ساس نے اسے منع کر دیا ہے کہ اب کیا کام ہے مدرسہ جانے کا ..... اب اگر تم گئیں تو اسکا مطلب یہی ہوا کہ آپ لوگ اپنی بہنوں کی کارستانیوں میں حصہ دار ہو اور راضی ہو۔

عائشہ: دیدی آپ تو آجایا کریں۔

کملا: مونیکا! ابو کہہ رہے تھے کہ مونیکا سے کہوکہ پڑھ کر واپس آجائے۔ وہاں شادی نہ کرنا، نہ جانے یہ لوگ تم دونوں کو کہاں کھپائیں گے۔

عائشہ: میری بہن آپ جس طرح ہماری رہائش سے مطمئن ہیں، اسی طرح شادی وادی کے چکروں میں بھی نہ پڑو۔ سب کو سلام کہنا اور میری دعا ہے کہ آپ سب کو اللہ دین کی ہدایت دے۔

دو ہفتہ بعد

بھنور میں ڈوب کے ابھرو کنارے مل ہی جاتے ہیں
اگر ہو جستجو سچی سہارے مل ہی جاتے ہیں

اب مدرسہ میں شب وروز یکسوئی سے گزرنے لگے۔ ہمارا قاعدہ ختم ہوچکا تھا اور ہم نے عم پارہ شروع کر دیا تھا۔ چالیس حدیثیں یاد کر لی تھیں۔ چالیس ہی قرآنی دعائیں یاد تھیں الحمدللہ۔ ہمیشہ سے تہجد کے ٹائم پر میری آنکھ کھل جاتی تھی، لہٰذا سب کو جگانے کی ڈیوٹی میں نے اپنے سر لی ہوئی تھی۔ عزیزوں کو خواب میں دیکھتی رہتی تھی۔ کبھی ان کو دعوتِ دین دے رہی ہوں۔ کبھی اپنے گھر میں قرآن پڑھ رہی ہوں۔ بہرحال مجھے قوی امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا، لیکن کب .....؟ یہ میرے اللہ نے میرے لئے راز میں رکھا ہے۔ میری ذات کو سنوارنے میں اللہ نے مجھے کون؟ اور کیوں؟ کے بھنور سے جلد آزاد کیا۔ مگر راز کھولنے میں میرا انتظار درکار ہے۔ (اللہ جلد وہ دن لائے آمین)۔

ٹھیک دو ہفتے بعد بہن کا فون آیا۔

کملا: مونیکا کیسی ہو؟ نیلم کہاں ہے؟

عائشہ: ٹھیک ہوں دیدی۔ یہ رہی مریم۔

مریم: دیدی کیسی ہو۔

کملا: ہاں میں ٹھیک ہوں! مریم ابو کہہ رہے ہیں مونیکا کو شادی نہ کرنے دینا۔ کسی طرح سے یہاں سے نکلو کسی اور ادارے میں چل کر پڑھو ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔

مریم: ہمیں کیا تکلیف ہے؟ ہمیں یہیں رہنے دو۔ آپ کو اور ابو کو کیوں ضد ہے کہ ہم یہاں سے جائیں؟

کملا: نہیں مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن ابو کو واقعی ضد ہوگئی ہے وہ کہتے ہیں کہ زندگی بھر یہاں سے نکلوانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ ان سے کہدو کہ شادی یہاں نہ کریں۔

مریم: ہم یہاں شادی کرنے نہیں آئے اور نہ ہی یہ مدرسہ، رشتہ گھر ہے۔ ابو سے کہیں بے فکر رہیں، یہاں یہ سب کسی کو یاد بھی نہیں ہے۔ لیکن آپ لوگوں نے یاد دلا دلا کر پریشان کردیا ہے۔ خدا حافظ۔

سوچ کے دائرے

میرپور خاص میں ہم جونہی گھر چھوڑ کر مولانا حفیظ الرحمان کے گھر یا مفتی صاحب کے گھر دوچار دن رہے تھے۔ علماء اور مفتی حضرات کا متفقہ مشورہ یہی تھا کہ اس سارے مسئلہ کا بہترین حل نکاح ہے، اس کے بعد عزیز واقارب خاموش ہوجاتے ہیں۔ لیکن ہمارے ذہنوں میں اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی، لہٰذا سوائے تعلیم حاصل کرنے کی کسی نکاح وغیرہ کے لئے اپنے آپ کو تیار نہیں کر پاتے تھے۔

گھر چھوڑنے کی قربانی دی ہے تو نیک عمل کیلئے دی ہے۔ کسی بدنامی کیلئے نہیں دی ہے۔ نکاح بھی نیک عمل ہے، لیکن والدین اور دنیا میں ہمارا کیا تاثر ہوگا؟ اس سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن علماء حضرات کی ہر باریک نقطے پر نظر ہوتی ہے، جس کا ہمیں گمان تک نہیں ہوتا۔ اب والدین کے بار بار تنگ کرنے پر اور شادی شادی یاد دلانے پر سوچ وسیع ہونے لگی، اب یہ نیا شوشہ تنگ کرنے لگا۔ ہم عزیزوں کی ٹیلیفونی گفتگو اپنے محسنوں سے کرتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے ہماری ساری پریشانی وہ ہی حل کرتے تھے ورنہ ہم ان سب گزرے ہوئے واقعات کو کیسے حل کر سکتے تھے۔

مفتی محمد نعیم صاحب اور مخیّر حضرات نے آپس میں مشورہ کیا۔ اس کے بعد میرپور خاص کے مولانا حفیظ الرحمان صاحب سے مشورہ کیا۔

خوشخبری

مولانا حفیظ الرحمان (میرے محسن حفیظ بھائی) سے رابطہ کرنے پر انہوں نے مفتی صاحب سے گفتگو کی:

مفتی نعیم صاحب: السلام علیکم! مولانا حفیظ الرحمان صاحب۔

مولانا حفیظ الرحمان: وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ مفتی صاحب آپ کیسے ہیں؟ مزاج بخیر!

مفتی صاحب: الحمدللہ! حفیظ صاحب آپ کی بہنیں الحمدللہ بخیریت ہیں۔ لیکن اب ایک اور معاملہ درپیش ہے۔ یہ بچیوں کے عزیز واقارب والد صاحب کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں، اب سنا ہے گورنر تک جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ (مفتی صاحب کو اپنے ذرائع سے بھنک پڑ چکی تھی)۔

مفتی صاحب: اور انہوں نے شادی شادی کی رٹ لگا رکھی ہے، بچیاں پریشان ہوجاتی ہیں۔

مولانا صاحب: جی جی! میں ان باتوں سے غافل نہیں ہوں، میرے علم کے مطابق یہی باتیں یہاں بھی گردش کررہی ہیں۔ جب سے بچیوں کو بنوریہ چھوڑ آیا ہوں، مطمئن ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے رشتوں کے لئے بھی فکرمند تھا اور اللہ رب العزت نے یہ مسئلہ بھی تقریباً حل کردیا ہے الحمدللہ۔ میں ایک ہفتہ کے بعد دوبارہ رابطہ کرکے خوشخبری دونگا۔

مبارک رشتہ

ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد رات کو مولانا صاحب نے مفتی صاحب کو خوشخبری سنائی۔ دوسرے دن مفتی صاحب کی اہلیہ مدرسہ میں آئیں اور ہمیں اپنے آفس میں بلایا۔

اہلیہ مفتی صاحب: عائشہ بیٹا! کیا حال ہیں آپ دونوں کے؟ پڑھائی کیسی جارہی ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟

عائشہ: شکریہ آنٹی! ہم بالکل ٹھیک ہیں، مدرسہ میں تو کوئی پریشانی نہیں لیکن ..... لیکن .....

آنٹی: لیکن کیا ..... کھل کر بتاؤ! میں آپکی ماں ہوں، ماں سے کیا پردہ بیٹے .....

عائشہ: مریم! تم بتاؤ ناں آنٹی کو کل کیا ہوا تھا۔

مریم: آنٹی گھر والے اب پھر تنگ کرنے لگے ہیں۔ کہتے ہیں ہم کو گورنر تک لے جائینگے۔ سیاسی تنظیم سے زور لگوائیں گے۔ صدر تک جائیں گے۔ کل ابو کا بذاتِ خود فون آیا تھا، کہ کیا کر لیں گے یہ ملا لوگ، خبردار! تم لوگ شادی نہ کرنا، ورنہ وہاں بھی نہ چھوڑیں گے وغیرہ وغیرہ۔

اہلیہ مفتی صاحب: ہاں بیٹا ہم بھی ایسا کچھ سن رہے ہیں۔ آپ کی سمجھ میں کچھ اس مسئلہ کا حل ہے کیا؟

عائشہ: آنٹی یہ مسئلہ تو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔ میر پور خاص میں ہی علماء حضرات کو یہ فکر لاحق تھی۔

اہلیہ مفتی صاحب: اب اگر اس مسئلے کو چھوڑ دیتے ہیں تو پریشانی، اور اگر حل کر لیں تو آپ کا کیا خیال ہے؟

عائشہ: جیسا آپ مناسب سمجھیں .....۔

اس کے بعد مفتی صاحب کی اہلیہ نے مولانا صاحب کا بتایا ہوا رشتہ ہمارے آگے رکھ دیا ہم دونوں ایک دوسرے کا حیرت سے منہ تکنے لگیں کیونکہ ایک ہی شہر میں رہنے سے اُن لوگوں کی تھوڑی بہت ہمیں شد بد تھی۔

مفتی صاحب کی اہلیہ: بیٹا آپ لوگ جانتی ہو ان کو؟

عائشہ: اگر پریس والا گھر آپ بتا رہی ہیں، تو ان کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ انتہائی دیندار گھرانہ ہے، پردے کے سخت پابند ہیں۔ انکا لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم ہے، چونکہ ان کے گھر میں لڑکے ہی لڑکے ہیں لہٰذا کوئی ان کے گھر نہیں جاتا اور نہ ہی یہ پسند کرتے ہیں۔ پورے میر پور خاص میں ان کی عزت اور دبدبہ ہے ہندو بھی ان سے دبتے ہیں یہ ہمارے گھر کے سامنے کچھ فاصلے پر رہتے ہیں، بہت بڑے لوگ ہیں۔ ہم نے کبھی ان کو دیکھا نہیں ہے کیونکہ ہم پر تو انکا بڑا رعب تھا۔

مفتی صاحب کی اہلیہ ہنسنے لگیں اور قدرت کے اس انوکھے ملاپ پر دیر تک تینوں انگشت بدنداں رہیں۔

قدرت کے کھیل نرالے ہیں

انہوں نے ہمیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ دونوں بہنوں کو مانگ رہے ہیں لیکن ہم ابھی ایک کا کر کے ان کو آزمائیں گے، پھر دوسرا رشتہ کرنے میں دیر نہیں کرینگے۔

مفتی صاحب کی اہلیہ: عائشہ بیٹا ایک دو ہفتہ میں مولانا حفیظ الرحمان کے ساتھ وہ لوگ ہمارے پاس ملنے آئیں گے۔ ہماری اور آپکی تسلی کے بعد یہ رشتہ منظور کر لیں گے۔ ایک شہر، بلکہ ایک پڑوس میں رہنے کے ناطے مجھ سے زیادہ آپ انکو جانتی ہوں گی، یہ اور اچھی بات ہوگئی ہے۔ اللہ رب العزت کو آپ بہنوں کی عزت وتکریم ہر صورت مقصود ہے اس کا مشاہدہ ہوگیا۔

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں کہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
تیرا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا تو چراغ راہ کے جل گئے

حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم

جمعہ کے دن میر پور خاص سے یہ حضرات مولانا کے ساتھ آئے۔ بذات خود لڑکا، انکے والد صاحب، والدہ صاحبہ وغیرہ۔ مفتی صاحب، مدرسہ کے اساتذہ حضرات اور دیگر مخیّر حضرات کو وہ لوگ بہت پسند آئے۔ انکا بڑا اکرام کیا گیا۔ اقرار کیلئے ان کو تھوڑا سا انتظار کرنے کو کہا گیا اور دو ہفتہ بعد انکو رشتہ کی رضامندی دے دی گئی۔ پورے مدرسہ میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ یہ رشتہ کس طرح ہوا؟ کیسے ہوا؟ قارئین کی دلچسپی کے لئے اس سلسلے میں مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب کی کاوشوں کا عکس انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا حفیظ الرحمٰن

ایک مخلص بھائی کے تاثرات انکی اپنی زبانی

عائشہ اور مریم کا کراچی جامعہ بنوریہ میں داخلہ ہوجانے کے بعد، میں میر پور خاص اس حال میں روانہ ہوا کہ میرا دل اور دماغ مطمئن تھے کہ ان کو صحیح جگہ پہنچا دیا۔ البتہ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسا کہ دو بہنوں کے لئے کسی بھائی کے دل میں فکر لاحق ہوتی ہے، اور سوچ یہ تھی کہ ان دونوں نے دین کے لئے جس طرح سے قربانیاں دیں اور مجھ پر اپنے حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر جو اعتماد کیا میں اس پر کس طرح پورا اتروں، یہی فکر دن رات میرا تعاقب کرتی تھی اور اب میری فکر اپنی حقیقی بہنوں سے بڑھ کر ان دونوں کی طرف توجہ دینے لگی۔ ہر دن، ہر رات مجھ پر بھاری گزرنے لگی۔ پھر میں ان دونوں کے لئے ایک بھائی ہونے کے ناطے اچھے رستے ڈھونڈنے میں مصروف ہوگیا، اور اچھے اچھے لوگ بھی ان دونوں کے مقابلے میں کم تر نظر آنے لگے۔ پھر اللہ

تعالیٰ کا بڑا کم ہوا کہ عائشہ کے لئے اللہ نے خاص کرم فرماتے ہوئے ایک بہت دین دار دوست جمشید کو منتخب فرمایا، جو میری ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتا ہے اور مجھ سے بے انتہا محبت کرتا ہے، لیکن مسئلہ اس کے والدین کا تھا، جو مجھکو جانتے تھے اور میں ان کو جانتا تھا، لیکن اتنی زیادہ دُعا سلام نہ تھی۔ پھر میں نے اللہ سے خوب دُعا مانگی اور مجھے اللہ کی ذات پر کامل یقین تھا اور ہے کہ اس کے والدین اور خاص طور پر اس کا والد ضرور مان جائیگا۔ پھر میں بسم اللہ پڑھ کے جمشید کے گھر روانہ ہوا اور اس کے والد سے جا کر ملا، ان دونوں بچیوں کی قربانیوں کے تذکرے کے بعد تھوڑی بہت ترغیب دی تو ان کے منہ سے نکلا ہوا جملہ سن کر میں حیران رہ گیا کہ ''اگر بیٹا جمشید راضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن میں اپنے والدین یعنی جمشید کے دادا، دادی کو اعتماد میں لے لوں، کیونکہ میں نے کبھی اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کی اور بڑھاپے میں، میں انہیں ناراض نہیں کر سکتا اور جمشید کے رشتے کی بات چیت خاندان میں کہیں اور بھی چل رہی ہے، لیکن اگر جمشید کی مرضی ہے، تو میری بھی مرضی ہے'' یہ جملہ اس بات کی دلیل تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان بچیوں کے ساتھ ہے۔ پھر اس کے بعد میں انتظار میں رہا کہ کب جمشید کے والد سے دوسری ملاقات ہوگی، کیونکہ اُس کے والدین اُس وقت پشاور کے قریب اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے، چونکہ جمشید کا گھرانہ شروع سے دین دار رہا ہے اس لیے مجھے یقین تھا کہ اس کے دادا، دادی بھی مان جائینگے۔ اس کے بعد جمشید کے والد نے اپنے والدین کو اعتماد میں لیا، یعنی جمشید کے داد، دادی بھی راضی ہوگئے۔ گویا کہ عائشہ کا رشتہ تقریبا پکا ہوگیا۔ اور میں نے یہ خوشخبری مفتی نعیم صاحب کو سنائی اور انکی اجازت سے جمشید اور اس کی فیملی کو کراچی جامعہ بنوریہ لے آیا اس فیملی سے مل کر مفتی صاحب بہت خوش ہوئے، لیکن ابھی بھی مجھے میری دوسری بہن مریم کی فکر آرام سے رہنے نہیں دیتی، اور میں اللہ تعالیٰ سے دن رات یہ التجا کرتا ہوں کہ مریم کیلئے بھی کوئی خیر کا فیصلہ فرمائے۔

نکاح مبارک

جامعہ بنوریہ آئے ہمیں چھٹا ماہ شروع ہو چکا ہے، اس اثنا میں ہم نے بہت کچھ سیکھا، مزید سیکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ پوری زندگی علم وعمل کی ہر بشر کو ضرورت رہتی ہے، ہم بھی اپنے آپ کو افلاطون نہیں کہہ سکتے لیکن باشرع سنت طریقہ سے زندگی گذارنے کے طور طریقے کافی حد تک سمجھ گئے تھے، اور ماشاء اللہ باعمل بھی ہوگئے تھے کیونکہ یہ ایک اسلامی مذہبی ادارہ ہے، اسمیں اسلام کے فرائض وسنت پر ہر وقت توجہ ہوتی ہے، اور ہر طالب علم باعمل ہو کر نکلتا ہے، اس مدرسہ کے لئے یہ مشہور ہے کہ یہاں کا فیل شدہ طالب علم بھی کسی اور مدرسہ میں جا کر پوزیشن لے لیتا ہے۔ میں تو ایسی ہی باعمل باشرع زندگی چاہتی تھی۔ اللہ رب العزت کا ایک اور وعدہ پورا ہو کر رہا کہ مجھ سے پیار کرنے والوں کو میں فرشتوں کے ذریعے اپنے پیارے بندوں سے پیار کرواتا ہوں۔ میری اس قسم کی زندگی کا احوال پورے میرپور خاص میں پھیل چکا تھا، جس کی وجہ سے اللہ رب العزت کی نصرت اس رشتہ کی صورت میں ہوئی کہ میرپور خاص کے نہایت ہی معزز ودین دار گھرانے نے ہمیں اپنے قابل سمجھا، اپنے مالک کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔

ابو اور بہنوں کے سارے اندیشے میرے مالک کو پسند نہیں تھے، اُن کو تو اپنے خالق پر اعتبار ہی نہیں تھا، تو اکرام کیسا۔ لیکن پھر بھی میں سمجھتی ہوں کہ میرے والدین پر اکرام ہے کہ مجھے بااکرام کیا۔

میرے شکر کے سجدے طویل ہوگئے

یوسف زئی پٹھان فیملی میں میرا رشتہ جُڑا اور یوں میرا بروز جمعہ ۱۲ جون ۲۰۰۹ء کو جمشید خان سے نکاح مبارک ہوا۔ میں عائشہ سے عائشہ خان کہلائی، اللہ رب العزت کی ایک اور مصلحت سمجھ میں آئی۔ کالج کی دوستوں کے مکالمے ذہن میں گردش کرنے لگے کہ ''عائشہ کو خان کی پخ'' کیسے لگی؟ میرے مالک نے میری دوستوں کی چھٹی حس کو شعور بخشا۔ یہ ہوتیں ہیں چھٹی حس میں شعوری بشارتیں، جو بندے کے قلم یا زبان سے نکل کر دوسرے لوگوں کے ذہنوں تک رسائی لیتی ہیں۔ ان بشارتوں کے پورے ہونے کا ایک متعین وقت ہے جو لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے۔

اب سوچتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نوازنے میں کبھی دیر نہیں کی! صرف چھ ماہ میں عائشہ سے عائشہ خان بنادیا۔ لفظ ''خان'' کا محفوظ سائبان عطا کر کے۔

میری اللہ رب العزت سے ہر مومن ومومنات دُعا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنے رب اور اس کے حبیب کی محبت میں رہیں اور اُن غیر مسلموں کے لئے دُعا گو ہوں جو ابھی تک صراطِ مستقیم نہیں پاسکے ہیں، وہ خواتین وحضرات جو خواہشمند ہونے کے باوجود ہمت نہیں کر پا رہے۔ میری دُعا ہے کہ وہ جلد از جلد اس گناہ کے بھنور سے چھٹکارا پائیں۔ آمین

رخصتی سے پہلے

رخصتی سے دودن پہلے کا واقعہ

رخصتی سے دو دن پہلے بھی ایک آزمائش کی گھڑی آئی والدین کی طرف سے، انہوں نے سپریم کورٹ میں ایک اور ہمارے خلاف پٹیشن داخل کی، جس کی وجہ سے ہمارے محسن مفتی صاحب بہت پریشان ہوگئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رخصتی میں رکاوٹ ہوجائے، لیکن اللہ رب العزت کو ہمارا یہ بھی اکرام منظور تھا۔ کیونکہ سپریم کورٹ نے DPO میرپورخاص منیر احمد شیخ صاحب سے رپورٹ طلب کی، جنہوں نے مدرسہ سے سارے ہائی کورٹ کے کیسوں کے کاغذات منگوا کر رپورٹ بنا کر بھجوادی۔ یہ مناسب ہوگا کہ میں دین کے اس محافظ منیر احمد شیخ کی دیندارانہ خصلت کی تعریف کروں کہ انہوں نے نہایت دیانتداری سے ہماری رپورٹ بنا کر سپریم کورٹ بھیجی، ہمیں اور مفتی صاحب کو اِن فکرات سے آزاد کیا، اللہ انکی عزت وتکریم میں اضافہ کرے۔ آمین۔

یہ وہی منیر احمد شیخ ہیں جن کی ہائی کورٹ نے ہمارے کیسوں میں تفتیش کے لئے مقرر کیا تھا اور انہوں نے دیانتدارانہ تفتیش کرکے ہمارے حق میں ہائی کورٹ میں رپورٹ بھجوائی تھی۔ قابلِ تعریف تو ہر وہ شخصیت تھی جنہوں نے اس راہِ سفر میں ہمارا ساتھ دیا۔ ہم پر تو اُن کے احسانات دنیاوی تھے، لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ہر ایک نے فی سبیل اللہ اپنے دین کی حفاظت کیلئے یہ مجاہدہ کیا۔ ایسے ہی اگر دین اسلام کے مجاہد، اپنے دین کی حفاظت کے لئے کمر بستہ ہوجائیں تو نبی کریم ﷺ کی خواہش کہ ''میرا یہ پیغام جو حاضر ہیں وہ غیر حاضر تک پہنچادیں'' پوری ہوجائے گی اور ہو بھی رہی ہے اللہ اس خواہش کو مزید جلا بخشتے۔ آمین

رخصتی

مفتی محمد نعیم صاحب، انکی اہلیہ اور دوسرے مخیّر خواتین وحضرات (خصوصا زیبی جیولرز) نے ان چھ ماہ میں کس طرح اپنی اولاد کی طرح ہماری پرورش کی، اس کی مثال کم ازکم میں نے اپنی زندگی میں نہ کہیں سنی اور نہ ہی کہیں دیکھی۔ بہت ہی کم ایسے لوگ ہوتے ہیں، مجھے نکاح ورخصتی میں ایک لمحہ کیلئے بھی والدین کی کمی محسوس نہیں ہوئی اور نہ ہی اُن کی یاد آئی۔ یہ میری زندگی کے بڑے عجیب لمحے تھے کہ ہر لمحہ والدین کو یاد کرنے والی کو اِن لمحوں میں اتنا پیار، اپنائیت اور محبت ملی کہ والدین کی یاد تک نہ آنے دی، شاید میری پیاسی روح کو دین کے کوثر نے سیرِ آب کر دیا تھا۔

مفتی صاحب اور مدرسہ سے تعلق رکھنے والے دین کے یہ کوثر، اللہ رب العزت کے معجزانہ اکرام، کہ مجھے واپس اُس دیس میں بھیج دیا جہاں کیلئے میں چھ ماہ تڑپتی رہی تھی۔ اِن سب نے ملکر میرے اللہ اور اسکے حبیب پر کامل یقین کو جلا بخشی۔ مفتی صاحب نے میری رخصتی میں دوتین سو مہمان حضرات کو مدعو کیا۔ برأت کے اکرام میں اُن سب مہمان حضرات نے بھرپور حصہ لیا، ہر کسی کے زبان پر یہی الفاظ تھے کہ آج مفتی صاحب کی دُختر کی رخصتی ہے، پُرتکلف دعوت، ہدیہ، برأت کا پرجوش استقبال واکرام نے منظر جذباتی بنادیا، اور تشکر وفخر سے آنسو تھمتے نہ تھے، زبان گنگ، ایک لفظ بھی ادا نہ کر پارہی تھی۔ ہمارے محسن وکیل صاحب جناب جسٹس ریٹائرڈ مشتاق احمد میمن صاحب نے اپنی اہلیہ اور صاحبزادے بیرسٹر اشتیاق احمد میمن کے ہمراہ میری رخصتی میں بطور خاص شرکت فرماکر ہماری عزت افزائی کی۔ آنٹی (امی) سے گلے لگ کر الگ ہونے میں صدیاں بتادیں ..... کیسے الگ ہوں میں! ..... ایسی پیاری اور پُرشفقت گود ..... بڑی مشکل سے مریم نے اور ہمجولیوں نے یہ کہہ کر الگ کیا کہ ''ہم نے تمہارے میک اپ پر اتنی محنت کی ہے اب اسے خراب تو نہ کرو۔'' پورے مدرسہ کے طلباء وطالبات، اساتذہ، ناظم وناظمہ حضرات ومہمانوں کی دُعاؤں کے ساتھ اپنی امی (آنٹی) کے سہارے گاڑی تک آئی، مفتی صاحب قریب آئے اور گلوگیر پُرشفقت لہجہ میں فرمایا:

مفتی صاحب: بیٹی! ''اللہ کی امان میں'' میں تمہیں نہایت ہی نیک لوگوں میں رخصت کررہا ہوں، جسطرح میرے پاس تم ایک مثالی بیٹی بن کر رہیں، انشاء اللہ اسی طرح مثالی بیوی اور بہو بھی ثابت ہوگی، میری دُعائیں ہمیشہ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔ آمین

میں نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر بڑی مشکل سے اپنی چیخوں کو دبایا اور جلدی سے گاڑی میں جابیٹھی اپنے ہمسفر کے ساتھ انجانی راہوں پر .....؟ نہیں نہیں ..... جانی پہچانی راہوں کی طرف۔

مفتی صاحب مریم کے رشتہ میں کچھ توقف کرنا چاہتے ہیں، یہ ایک والد کی حکمت ودانائی

ہے، جو اپنی بیٹی کیلئے زیادہ مناسب سمجھتے ہیں، سب نے اس بات کو منظور کر لیا ہے۔ دو دن کے بعد ہمارے مدرسہ میں طالبات کی ختم بخاری ہے، انشاء اللہ میں ضرور حاضری دوں گی معہ اپنے ہمسفر کے۔

قدرت کا یہ عقل کو حیران کر دینے والا شاہکار، رہتی دنیا تک نسل در نسل لوگ بیان کرتے رہیں گے۔ جن کے سامنے یہ شاہکار قصہ گزرا ہے، کہ کس طرح یہ بچیاں اپنوں کیلئے تڑپتی تھیں، انکے اپنوں میں جانے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی، اور اللہ رب العزت کے پاس اس کا کیا انتظام تھا؟

آخر میں قارئین حضرات سے مصنفہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے خاتمہ بالخیر کی دُعا کی درخواست کرتی ہے کہ:

سب کو رب غفور دیتا ہے
ہے وہ داتا ضرور دیتا ہے
یہاں پھولے پھلے چمن سے کا
وہاں جنت میں ہو وطن سب کا
باپ ماں بھائی اور کل مومن
بخش دینا خدا جزا کے دن
یا الٰہی میں لوں عدم کی راہ
پڑھتے ہی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ